به سلسلهٔ مطبوعات ادارهٔ ثقافتِ اسلامیه، لاہور

منکر نتواں شد گر دم زنم از عشق
ایں نشہ بمن نیست اگر با دگرے ہست

روحِ اسلام

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ایم اے، پی، ایچ، ڈی

روحِ اسلام

اگر اسلام کی ایک مختصر اور عام فہم تعریف کی جائے، تو کہا جائے گا کہ انبیاء کی تعلیم کا نام اسلام ہے۔ یہ تعلیم سب سے پہلے نبی حضرت آدم سے شروع ہوئی، اور اس کا سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا، پہلے اور آخری نبی کے درمیان لاتعداد پیغمبر مبعوث ہوئے۔ ایک روایت میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے، کہ کوئی قوم اور کوئی بستی ایسی نہیں، جس میں ایک پیغمبر نہ بھیجا گیا ہو، وَاِنْ مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ، ترجمہ:۔ کوئی بستی ایسی نہیں، جس میں ایک نبی نہ آیا ہو، وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ، ترجمہ:۔ کوئی اُمت ایسی نہیں جس میں ایک نبی نہ آیا ہو۔ ان سب انبیاء کی تعلیم اپنی اصل یا بنیاد کے لحاظ سے ایک ہی تھی، اس لیے ہر نبی تمام پہلے انبیاء کی تعلیم کی تائید اور توثیق کرتا رہا ہے اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جو شخص گذشتہ انبیاء میں سے ایک نبی کی تعلیم کا بھی منکر ہے، وہ گویا اُس کا بھی منکر ہے اور مسلمان ہی نہیں۔ لا نفرق بين احد من رسله ونحن له مسلمون، ترجمہ:۔ ہم اس کے نبیوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے، یومنون بما انزل اليك وما انزل من قبلك، ترجمہ:۔ وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تجھ پر نازل کیا گیا اور اُس پر جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا۔

اگر پوچھا جائے کہ ان لاتعداد انبیاء کی تعلیم کا ماحصل، یا روح یا نچوڑ کیا تھا، تو ہم ایک لفظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ "محبت" اسلام محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسی محبت کی تعلیم، جو خالص بے لاگ اور بے غرض ہو، جو دائمی اور لازوال ہو، جو اپنے کمال کی طرف ہمیشہ بڑھتی رہے اور جس میں کمی یا مایوسی کا قطعاً کوئی امکان موجود نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ قدرت کو اس تخلیق کی ضرورت کیا تھی۔

اس نے کبھی انسان کو اپنے حال پر نہ چھوڑ دیا، اور کبھی پے در پے انبیاء بھیجے، تاکہ انسان کو ایک خالص، کامل اور لازوال محبت کی تعلیم دیں، اس کی وجہ نہایت معقول ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت اس قسم کی محبت کی پیاسی ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ اس قسم کی محبت کے لئے بے قرار ہے، تڑپ رہا ہے، وہ ہر آن اور ہر لمحہ اس قسم کی محبت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اُس نے اپنی ساری زندگی اسی کی تلاش کے لئے وقف کر رکھی ہے، وہ اس تلاش میں ٹھوکریں کھاتا ہے، بڑی ہلاکت خیز مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، جان پر کھیل جاتا ہے، لیکن اس کی تلاش نہیں چھوڑتا۔ کیوں کہ چھوڑ ہی نہیں سکتا، اس کی محبت اُسے مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے محبوب کی تلاش کرے، جو اُس کی فطرت کے تقاضائے محبت کو تمام و کمال پورا کر سکے، جسے وہ دل و جان سے چاہے، اور الفت کرے، پہلے انسان سے لے کر آج تک نوعِ بشر کی ساری تاریخ اسی محبوب کی تلاش کی ایک طویل داستان ہے جس کے اکثر باب گو خونچکاں اور دلفگار ہیں، لیکن بعض بعض دل افروز اور دل نواز بھی ہیں۔ خدا کے انبیاء اس لئے آئے تاکہ انسان کو بتائیں کہ وہ جس محبوب کو چاہتا ہے، وہ کون ہے اور اُسے محبت کرنے اور اس کی محبت اور رضامندی حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ گویا دینِ اسلام، دینِ قیّم یا انبیاء کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس کی دائمی غیر مبدل فطرت کے تقاضوں کا صحیح علم بہم پہنچایا جائے، تاکہ اس علم کی مدد سے وہ ان کو با احسن طریق پورا کر سکے، "اقم وجهك للدين حنيفا۔ فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم۔ ایک حدیث میں ہے، ما من مولود الا يولد على فطرة الاسلام فابواه يهودانه او ينصرانه او يمجسانه، ترجمہ:۔ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے والدین اُسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا تے ہیں۔

اب بالتفصیل دیکھنا چاہیئے کہ انسان کی فطرت کے معنی کیا ہیں اور اُس کی فطرت کی

محبّت کس نوعیت کی ہے۔ انسان کی فطرت سے مراد انسان کی پیدائشی خواہشات ہیں ان خواہشات کے دو طبقے ہیں، ایک تو اُس کی وہ خواہشات ہیں، جو حیوانی یا حیاتیاتی سطح پر ہیں مثلاً خوراک کی خواہش، جنسی تعلقات کی خواہش، ایسی چیزوں سے خوف یا نفرت جو بقائے حیات کے لئے مُضر ہوں۔ ایسی چیزوں سے رغبت جو بقائے حیات کے لئے موید و موافق ہوں وعلیٰ ہٰذالقیاس۔ انسان کی یہ خواہشات اس میں اور نچلے درجہ کے حیوانات میں مشترک ہیں، کیونکہ انسان بھی ایک حیوان ہے۔ اگرچہ وہ حیوانِ ناطق ہے۔ ان خواہشات کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی اور اپنی نسل کی زندگی کو قائم رکھ سکے، لہذا ان کی تکمیل کے لئے، حیوان کے جسم کے اندر ایک فطرتی حیاتیاتی (BIOLOGICAL) دباؤ موجود ہوتا ہے اور حیوان اس دباؤ سے مجبور ہو کر ان کی تکمیل کرتا ہے۔ اگر ان خواہشات کے اندر یہ دباؤ موجود نہ ہوتا، تو انسان ان کو نظر انداز کر دیتا اور اس کی اور اس کی نسل کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی۔ انسان کی ان خواہشات کو جو ایک اندرونی حیاتیاتی دباؤ رکھتی ہیں اور اس میں اور نچلے درجہ کے حیوانات میں مشترک ہیں، جبلّتوں[1] کا نام دیا گیا ہے، اگر انسان کے اندر یہی خواہشات ہوتیں تو ان کی تکمیل کے لئے کسی سلسلۂ انبیاء کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ جس طرح حیوان مجبوراً ان کی تکمیل کر لیتا ہے انسان بھی کر لیتا ہے۔ اور پھر انسان، انسان کا ہے کو ہوتا، وہ حیوان ہی ہوتا، اور حیوان ہی کہلاتا، لیکن انسان کے اندر خواہشات کا ایک اور طبقہ بھی ہے، جو اس طبقہ سے اوپر ہے۔ انسان کی خواہشات کا یہی طبقہ انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کرتا ہے، وہ انسان کے ساتھ خاص ہے اور حیوان اُس سے قطعاً بہرہ ور نہیں، اس طبقہ کی خواہشات حیاتیاتی نوعیت کی نہیں بلکہ نفسیاتی نوعیت کی ہیں یعنی ان کا مقصد جسم کی نشوونما نہیں، بلکہ روح یا نفس انسانی کی نشوونما ہے، اس طبقہ کی ساری خواہشات صرف ایک خواہش کے تابع ہیں۔ اور لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ اس طبقہ میں صرف ایک ہی خواہش موجود ہے۔ یہ خواہش کسی حسین وجمیل تصور یا نصب العین (یعنی ایسا تصور یا نصب العین) جس کی طرف

[1] INSTINCTS

انسان حسن و جمال کی انتہا منسوب کرے، خواہ اس میں موجود ہو یا نہ ہو) کی شدید محبت کی صورت اختیار کرتی ہے، تصوّر یا نصب العین کی محبت، اگر پوری طرح سے ترقی کر کے قوی ہو جائے تو انسان کی ساری شخصیت پر حکمران ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نچلے درجے کی ساری خواہشات کو اپنی اغراض کے لئے کام میں لاتی ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو ان کے شدید اندرونی دباؤ کے باوجود ان کو روک دیتی ہے، یہاں تک کہ خود جسم کو جس کی حفاظت اور نشو و نما کے لئے وہ موجود ہیں، ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔ انسان اگر اپنے تصوّر سے شدید محبّت رکھتا ہو، تو اس کی خاطر مرنے سے دریغ نہیں کرتا۔

وہ تصوّر یا نصب العین جسے انسان اپنا محبوب بنائے، کیسا ہونا چاہیئے، اس کا جواب خود انسان کی فطرت یا اس کے جذبۂ محبت کی نوعیت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ صرف ایسے تصور سے تسکین اور اطمینان پا سکتا ہے، جو اپنے اوصاف میں ہر ایسے عنصر سے پاک ہو، جسے انسان کسی طرح سے بھی نقص قرار دے سکے، کیونکہ نقص محبّت کا دشمن ہے، انسان کی فطرت کسی تصوّر کو ناقص جان کر اس سے محبّت نہیں کر سکتی، ناقص تصور سے محبّت کرتی ہے، لیکن اسی وقت تک، جب تک کہ اس کا نقص، انسان کی نظروں سے اوجھل رہے۔ اور اس میں اسے کمال ہی کمال نظر آئے، اس کے برعکس انسان کے محبوب تصوّر کے اندر وہ تمام صفات بدرجۂ کمال موجود ہونے چاہیئں، جن کی طرف وہ حسن و جمال منسوب کرتا ہو یا کر سکتا ہو۔ پھر اس کے حسن و جمال کی کوئی انتہا نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اگر کبھی اس کی انتہا پہنچ جائے تو پھر انسان کی فطرت ایسی ہے کہ وہ اس سے سیر ہو جاتی ہے اور سیر ہو کر بیزار ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرتی محبّت کسی ایسے محبوب کے لئے بنائی گئی ہے جس کے حسن کی کوئی حد نہیں، پھر وہ محبوب ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کی اچھائیوں اور خوبیوں میں کوئی دوسرا ذرّہ بھر شریک نہ ہو۔ کیونکہ انسان کی فطرت بیک وقت ایک سے محبّت کر سکتی ہے، دوسے نہیں کر سکتی۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ۔ پھر انسان چونکہ خود

زندہ ہے۔ وہ کسی مُردہ کو محبوب نہیں بنا سکتا۔ مُردہ ہونا ایک عیب ہے۔ پھر اس محبوب کی زندگی ایسی ہونی چاہیئے جو ازلی اور ابدی ہو، جسے کبھی فنا نہ ہو۔

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است
وز شراب جانفزایت ساقی است

کیونکہ اگر اسے کبھی فنا آسکتی ہو تو وہ آج بھی بالقوہ مُردہ ہی ہے۔ پھر ضروری ہے کہ اس میں زندگی کے وہ تمام اوصاف، جن سے انسان ایک گونہ آشنا ہے، بدرجۂ کمال موجود ہوں، یعنی وہ سمیع و بصیر ہو اور علیم و خبیر ہو، انسان کی ہر بات سمجھتا ہو، اس کے دل کی محبّت کو جانتا ہو، اور اس کی قدردانی کر سکتا ہو، یعنی محبت کا جواب محبت سے دے سکتا ہو، انسان کی فطرت ایسی شخصیت سے ہی محبت کر سکتی ہے جو خود محبت کرنے والی ہو، وَدُوْدٌ ہو، پھر انسان چاہتا ہے کہ سارے اختیارات اُس کے محبوب کے ہاتھ میں ہوں، یعنی وہ قادر مطلق ہو، ورنہ کوئی دوسرا اس کی محبت میں شریک ہو جائے گا، حالانکہ اُس کے دل میں کسی دوسرے کے لئے گنجائش ہی نہیں۔ وہ اس کا اور ساری کائنات کا خالق ہو، کیونکہ اگر انسان اور ساری کائنات انسان کے اُس محبوب کی قدرت کے بغیر، خود بخود وجود میں آگئے ہوں، تو پھر انسان کو اس سے کیا علاقہ ہے اور انسان کو کیا پڑی ہے کہ اُسے اپنا محبوب بنائے، پھر تو انسان اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن اس کی فطرت ایک ہمسر کو نہیں چاہتی، بلکہ ایک ایسی ہستی کو چاہتی ہے جو اُس ساری شان عظمت اور کبریائی کی مالک ہو، جس کا تصوّر انسان کر سکتا ہے بلکہ اس کی شان عظمت اور کبریائی اس سے بھی زیادہ ہو، یہی نہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا محبوب بعض باتوں کو پسند کرے اور بعض کو ناپسند کرے۔ اس کی کوئی مرضی اور مدعا ہو تاکہ وہ اس کی مرضی کو پورا کر کے اس کی خدمت اور اطاعت کی لذّت سے بہرہ اندوز ہو۔ اس کے بغیر اس کی محبّت ناتمام اور تشنہ رہ جاتی ہے پھر وہ محبوب بے دست و پا نہ ہو کہ جو چاہے اس کی مرضی کی مخالفت کرے اور وہ کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکے، اور نہ اس کے چاہنے والے تو اس کی مرضی پوری کریں گے اور اس کے ستانے والے ان کا

بنا ہوا کام بگاڑتے چلے جائیں گے۔ اور اس کی مرضی کبھی پوری نہیں ہوگی، اور اس کے چاہنے والے بھی اس کی اطاعت، خدمت اور محبت کو ایک بے سود مشغلہ تصور کرنے لگیں گے اور سمجھیں گے کہ ان کا محبوب ایک کمزور اور ناتوان ہستی ہے، جو قطعاً محبت کے قابل نہیں، پس انسان کے محبوب کے اندر، صفاتِ جمال کے ساتھ ساتھ، صفاتِ جلال یعنی قہر، غصہ اور انتقام کی صفات کا ہونا بھی ضروری ہے اور نہ اس کے اندر صفاتِ جمال بھی موجود نہیں ہونگی۔

اگر انسان کو معلوم ہو جائے کہ ان صفات میں سے، کوئی ایک صفت، یا اس کا کوئی جزو، یا کوئی پہلو ایسا ہے جو اس کے محبوب کے اندر موجود نہیں، تو وہ اسے ایک نقص سمجھتا ہے اور فوراً اُسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی فطرت کی محبت ایک ایسے نئے محبوب کی تلاش میں نکل پڑتی ہے، جو بدرجۂ کمال ان تمام صفات کا مالک ہو، جب تک انسان کو محبت کرنے کے لئے اس قسم کا تصور نہ ملے، اس کی محبت تشنہ رہتی ہے اور اس کے دل کو اطمینان یا قرار نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی تلخ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انسان ایک درخت یا ایک پتھر یا زمین کے ایک ٹکڑے کو بھی اپنا محبوب قرار دے، تو اس کو بھی زندہ اور سمیع و بصیر اور علیم و خبیر سمجھتا ہے۔ اور تمام صفات جمال و جلال، اس کی طرف منسوب کرتا ہے، جب انسان ایک تصور کو اپنی محبت کے لئے منتخب کرتا ہے، تو چونکہ وہ اس کی طرف صفات کمال منسوب کرتا ہے، اُسے دل و جان سے چاہتا ہے اس کے گن گاتا ہے اور اپنی زندگی کی شب و روز کی ساری سرگرمیوں کو اس کی خدمت اور اطاعت کے لئے وقف کر دیتا ہے، لیکن چونکہ انسان کو ہستی کامل کا علم نہیں ہوتا، وہ اکثر اپنے انتخابات میں غلطی کرتا ہے اور ایک ایسے تصور کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے جس میں صفات جمال و جلال درحقیقت موجود نہیں ہوتیں، بلکہ ایک دو صفاتِ جمال کی جھلک، اس میں دیکھ کر وہ باقی صفاتِ جمال کو، غیر شعوری طور پر اس کی طرف منسوب کر دیتا ہے، لیکن جب وہ محبوب کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی صفاتِ

جمال پر غور کرنے، اور اس کی خواہشات کی پیروی میں تگ و دو کرنے کا موقعہ پاتا ہے، تو کچھ عرصہ کے بعد اُسے اپنے تصوّر کے نقائص نظر آنے لگتے ہیں۔ جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس تصوّر کو ترک کر کے دوسرے تصوّر کو اختیار کرتا ہے اور اگر یہ نیا تصوّر بھی غلط ہو تو کچھ عرصہ کے بعد اُسے بھی ترک کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ نوعِ بشر کی ساری تاریخ اور قوموں کے عروج و زوال کی ساری داستان، تصوّر کامل کی اس تلاش سے بنی ہے۔ جب ایک قوم کسی تصوّر کو اختیار کرتی ہے، تو اس کی اطاعت، خدمت اور محبّت کو کمال پر پہنچاتی ہے۔ یہ قوم کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب اس تصوّر کے نقائص اپنا عمل شروع کرتے ہیں تو اس کی محبّت انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یہ قوم کے انحطاط کا زمانہ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ قوم اس تصوّر کو ترک کرنے پر مجبور ہوتی ہے تو وہ مٹ جاتی ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایک طرف تو انسان کے شعور یا اس کی فطرت کے اندر ایک ایسے تصوّر کی محبّت رکھ دی گئی ہے، جو کمالِ حسن و جمال ہو، جو اس کا اِلٰہ یا معبود ہو، اور دوسری طرف کائنات کے معمّہ کا کوئی حل اس سے زیادہ معقول اور مدلّل اور حقائق علمی کے مطابق نہیں کہ انسان اور کائنات کا ایک خالق ہے جو صفاتِ جمالی اور جلالی کے کمال کا مالک ہے۔ انبیا کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ وہ تصوّرِ کامل جس کی تلاش میں وہ سرگرداں رہتا ہے اور جس کے عوض میں وہ غلط اور ناقص تصوّرات کو انتخاب کر کے بعد میں دُکھ، مایوسی اور تباہی کا شکار ہوتا ہے۔ وہی ذات پاک ہے جو اس کی اور کائنات کی خالق ہے۔ تم خواہ اسے کسی نام سے پکارو، لیکن وہی ہے جو صفاتِ جمال کا مالک ہے اور ان اوصاف کا مالک اور کوئی نہیں پس وہی ہے جو خدمت اور اطاعت اور تعریف اور محبّت کے لائق ہے۔ قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنیٰ۔ ترجمہ:۔ کہو اُسے اللہ کہو یا رحمٰن کہو، یا کسی اور نام سے پکارو۔ تمام اچھے نام اسی کے نام ہیں۔ وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا۔ ترجمہ:۔ تمام اچھے نام اللہ کے ہیں، اسے ان ناموں سے پکارو۔ الحمد للہ۔

(ترجمہ) سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے۔

ہر نبی کی دعوت کی ابتداء اور انتہا یہ تھی، لا الہ الا اللہ (خدا کے سوائے کوئی معبود یا محبوب نہیں، اپنی زندگی کو اس کی مرضی کے تابع بناؤ۔ اس کی عبادت کرو) حضرت نوح ؑ نے فرمایا تھا انی لکم نذیر مبین الّا تعبدوا الا اللہ۔ حضرت ہودؑ نے بھی یہی کہا تھا، یٰقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ۔ حضرت صالحؑ کی پکار بھی یہی تھی یٰقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ، اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی یہی تھی، یاایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم ـــــ انما یوحیٰ الیّ انما الٰھکم الٰہ واحدٌ چونکہ ناقص اور غلط تصورات بہت سے ہوسکتے ہیں اور کامل اور صحیح تصور صرف ایک ہی ہوسکتا ہے اس لئے اس عقیدہ کو عقیدۂ توحید کہتے ہیں۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اگر انسان کو صحیح اور کامل تصور کا علم نہیں تو نہ سہی۔ جب وہ تصور کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے تو تعلیم نبوت کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ تصور سے انسان کا چھٹکارا نہیں۔ وہ کسی نہ کسی تصور کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہے۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت کی ایک ایسی خواہش ہے۔ جسے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ملتوی نہیں کرسکتا۔ اگر اسے اچھا تصور ہاتھ نہ آئیگا۔ تو وہ کسی بُرے تصور سے اپنی فطرت کی ضرورت کو پورا کرے گا اور اسی کو ہر لحاظ سے اچھا تصور سمجھ لے گا۔ جیسے وہ شخص جسے بھوک لگی ہو، اگر گندم کی روٹی نہ پائے تو جَو کی روٹی اور بعض وقت درختوں کے پتے کھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن اپنی بھوک کے تقاضہ کو روک نہیں سکتا۔ تصور کی خواہش بھوک بلکہ انسان کی تمام خواہشات سے زیادہ قوی اور زیادہ شدید ہے اس خواہش کی تکمیل کے لئے انسان اپنی ساری خواہشات پر لات مار دیتا ہے۔ بلکہ زندگی تک کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اگر یہ خواہش ایک لمحہ کے لئے بھی رک جائے (جیسا کہ اس کے غلط استعمال کا پتہ چل جانے کے بعد اکثر ہوتا ہے۔) تو انسان جنون، ہسٹریا، پریشانی اور دوسری دماغی امراض کا

شکار ہو جاتا ہے اگر انسان کی اس اہم ترین خواہش کی تکمیل کا انتظام قدرت نہ کرتی تو بہت ستم ہوتا لیکن قدرت نے سلسلۂ انبیاء کے ذریعہ سے انسان کی اس ضرورت کی تکمیل کا انتظام کیا ہے لہٰذا نبوت انسان کے لئے ایک بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی رحمت ہے، وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین۔

انسان کی کوئی ضرورت ایسی نہیں جسکی تکمیل کا سامان قدرت خود فراہم نہ کرتی ہو جس طرح سے قدرت انسان کی حیوانی یا حیاتیاتی سطح کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام کرتی ہے مثلاً جس طرح سے اس کی پیاس بجھانے کیلئے پانی چشموں سے پھوٹتا اور دریاؤں اور ندی نالوں میں بہتا ہے یا جس طرح سے اس کی بھوک دور کرنے کیلئے زمین، ہوا، بارش اور سورج مل کر غلّہ پیدا کرتے ہیں اسی طرح سے انسان کی انسانی یا نفسیاتی سطح کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے خدا کے نبی اپنی دعوت لے کر آتے ہیں۔ انبیاء کی تعلیم کی پے در پے کامیابیاں خود اس بات کی دلیل ہیں، کہ ان کی تعلیم انسان کی فطرت کے ایک خلا کو پُر کرتی ہے اگر ہم انسان کی فطرت کے اس پہلو کو جس کی رُو سے انسان کسی نہ کسی تصورِ حیات کو خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے ٹھیک طرح سے ذہن میں رکھیں تو پھر کارخانہ قدرت کے اندر نبوت کا مقام اور تعلیم نبوت کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

ناقص تصورِ حیات ناقص معبود یا محبوب کو قبول کرنے کے نقصانات اس قدر شدید ہیں کہ اگر قدرت نبوت کے ذریعہ سے کامل تصورِ حیات کامل معبود یا محبوب کی طرف راہنمائی نہ کرتی تو کرۂ ارض پر انسان کی زندگی کے باقی رہنے کی کوئی امید نہ ہو سکتی، والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔ ناقص تصورات کے نقصانات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ایک تصورِ حیات، یا اِلٰہ یا معبود (خواہ وہ حقیقی ہو یا غیر حقیقی) انسان کے فکر و عمل پر کیا اثرات پیدا کرتا ہے، مختصراً وہ اثرات حسبِ ذیل ہیں

(۱) چونکہ انسان اپنے تصور کو تمام عمدہ صفات کا مالک سمجھتا ہے لہٰذا وہ اس سے شدید محبت پیدا

کرتا ہے اور اس کی تعریف اور حمد اور ستائش میں رطب اللسان رہتا ہے۔ چونکہ وہ غیر حقیقی معبود کی طرف بھی حقیقی معبود ہی کی صفات منسوب کرتا ہے لہٰذا وہ اُسے بھی حقیقی معبود ہی کی طرح چاہتا ہے ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ والذین اٰمنوا اشد حبًا للہ (۲) انسان اپنی ساری زندگی کو اس کی خدمت اور اطاعت کیلئے وقف کر دیتا ہے چونکہ وہ جانتا ہے کہ اس تصور کی تائید اور ترقی کے لئے کون سا کام اسے کرنا چاہیئے اور کون سا نہیں کرنا چاہیئے وہ اس تصور کی نوعیت سے اپنے لئے ایک ضابطہ یا قانون حیات اخذ کرتا ہے جو اوامر اور نواہی پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کی ساری زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل کا کام دیتا ہے انسان تصور کی محبت سے مجبور ہو کر اس ضابطہ حیات پر عمل کرنے کیلئے ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ اگر وہ فی الواقع اپنے تصور سے محبت کرتا ہو تو وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کے تصور کی فطرت کے منافی ہو، یا اس کے مفاد کو نقصان پہنچائے (۳) ایک تصور کے پرستار اپنے فطرتی جذبہ محبت کی نوعیت سے مجبور ہو کر جس طرح تصور سے محبت کرتے ہیں اسی طرح ایک دوسرے کیساتھ بھی محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ مل کر ایک جماعت یا ایک سوسائٹی کی شکل اختیار کرتے ہیں جسے اسٹیٹ یا ریاست کہا جاتا ہے یہ ریاست ان کے مشترک تصور کی خدمت اور اطاعت کیلئے وجود میں آتی ہے اور اس کے ذریعہ سے افراد اپنے تصور کی خدمت اور اطاعت کیلئے اور زیادہ قوی اور مستعد ہو جاتے ہیں۔ ریاست کے اندر فرد اور جماعت کی زندگی ریاست کے تصور حیات کے ماتحت صورت پذیر ہوتی ہے جماعت کا نظام معاشیات، نظام قانون، نظام اخلاق، نظام سیاست، نظام تعلیم نظام حکومت حکمت صلح و جنگ، غرضیکہ فرد اور جماعت کی زندگی کا ہر شعبہ جماعت کے تصور کی ضروریات کے ماتحت وجود میں آتا ہے۔

ان تصریحات کا مطلب یہ ہے کہ فرد اور جماعت کی مدح و ذم کا معیار، ضابطہ اخلاق و عمل نظام تعلیم و تعلم، نظام اقتصادیات و معاشیات، نظام حکومت و سیاست، نظام قانون و عمل حکمت صلح و جنگ سب کی سب ہمارے تصور حیات ہی کی شاخیں ہوتی ہیں اور ان کی نوعیت

اور فطرت ہمارے تصور کی نوعیت اور فطرت پر موقوف ہوتی ہے جس قدر ہمارا تصور بلند اور اعلیٰ ہوگا اسی قدر ہماری زندگی کے یہ پہلو بھی عمدہ سلجھے ہوئے بے نقص و بے عیب ہوں گے۔ انبیاء کے پیش کردہ تصور توحید سے بلند تر اور اعلیٰ تر تصور ممکن ہی نہیں، کیونکہ اس سے بلند تر تصور ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ تصور بھی ہماری انفرادی اور جماعتی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے ان کی ایک خاص نوعیت مقرر کرتا ہے اور انہیں ایک خاص شکل دیتا ہے ان کی یہ شکل یا نوعیت براہ راست تصور کامل کی فطرت یا حق تعالیٰ کے اوصاف جمال سے ماخوذ ہوتی ہے۔ جب ہمارا تصور حیات عمدگی، خوبی اور پاکیزگی کے کمال پر ہو جیسا کہ توحید کا تصور فی الواقع ہے تو ضروری ہے کہ ہماری زندگی کا ہر ایک پہلو بھی عمدگی، خوبی، اور پاکیزگی کے کمال پر ہو لہٰذا جونہی کوئی انسان خدا کی الوہیت کا اقرار کرتا ہے اس کی ساری زندگی بدل جاتی ہے وہ رفتہ رفتہ خداوند تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہوتا جاتا ہے اور صفات باریتعالیٰ کی عمدگی، خوبی اور پاکیزگی اسکی زندگی کے اندر سرایت کرتی جاتی ہے

تعلیم نبوت سے انحراف کو اسلام کی اصطلاح میں کفر کہا جاتا ہے۔ کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان غلط تصورات کی محبت پر قائم رہتا ہے۔ غلط تصورات کی محبت کے نقصانات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) غلط تصور میں چونکہ صفات حسن در حقیقت موجود نہیں ہوتے اس کی محبت سے غلط قسم کی حمد و ستائش پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کی اقدار کے متعلق انسان کا زاویہ نگاہ غلط ہو جاتا ہے انسان اچھی چیزوں کو بُرا اور بُری چیزوں کو اچھا سمجھنے لگتا ہے جو چیز محبت کے لائق ہو اس سے نفرت کرتا ہے اور جو چیز نفرت کے لائق ہو اس سے محبت کرتا ہے اس کی آنکھیں غلط دیکھتی ہیں اس کے کان غلط سنتے ہیں اس کا دماغ غلط سوچتا ہے اور دل غلط سمجھتا ہے گویا اس کی آنکھیں اس کے کان اس کا دماغ اور دل کام ہی نہیں کرتے، لهم اعین لا یبصرون بها و لهم اذان لا یسمعون بها و لهم قلوب لا یفقهون بها۔ غلط تصور کے پرستار انصاف، نیکی، مساوات، سچائی کا نام لیتے ہیں لیکن ان کے ذہن میں انصاف، نیکی، مساوات، جمہوریت اور سچائی کے معنی وہ نہیں ہوتے جو حق پرستوں کے ذہن میں ہوتے ہیں نہ صرف یہ کہ ہر غلط تصور کا پرستار اخلاقی

اقتدار کے معنی غلط سمجھتا ہے بلکہ غلط تصورات کے ماننے والے ان اقتدار کے معنی کے متعلق ایک دوسرے سے بھی اختلاف رکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تصور کی نیکی، سچائی اور مساوات الگ قسم کی ہوتی ہے (۲) اپنی صحیح فطرت کو پانا اور بتمام و کمال اس کی ممکنات کا اظہار کرنا انسان کی منزل مقصود ہے جس پر زود یا بدیر پہنچنے کیلئے ہر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے لیکن اس منزل پر انسان صرف ایسے عمل ہی سے پہنچ سکتا ہے جو خدا کی محبت کے ماتحت سرزد ہو، غلط تصور کی محبت کے ماتحت جو عمل سرزد ہوتا ہے۔ وہ انسان کو اس کی منزل کی راہ پر نہیں لے جاتا بلکہ اس سے دور ہٹاتا جاتا ہے وہ اس راہ پر جس قدر آگے جائیگا۔ منزل سے ہٹتا جائیگا اور منزل کی طرف بڑھنے کے لئے اسے پھر واپس آنا پڑے گا خواہ یہ صورت فرد کی موت کے بعد ہی پیدا ہو لیکن انسان کی فطرت اس بات کی ضامن ہے کہ یہ ضرور پیدا ہو کر رہے گی پھر اسے معلوم ہوگا کہ اس کا سارا عمل بیکار تھا۔ ناقص تصور ناپائیدار ہوتا ہے اس کی محبت تادیر قائم نہیں رہتی کیونکہ اس کا نقص زود یا بدیر ظاہر ہو کر رہتا ہے پھر اس کا ماننے والا اسے خود ہی چھوڑ دیتا ہے جو شخص سچے خدا کو چھوڑ کر جھوٹے خدا کی عبادت کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بڑھیا عرصہ دراز تک محنت سے سوت کاتے اور جب کات چکے تو اپنے ہی ہاتھوں سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ قرآن اس بیسود مشغلہ سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے، ولا تکونوا کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا، غلط تصور بیت عنکبوت کی طرح کمزور اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ ان الذین اتخذوا من دون اللہ انداداً کمثل العنکبوت اتخذت بیتاً فان اوھن البیوت لبیت العنکبوت، یا اس کی مثال ایک ناکارہ پودے کی طرح ہے جسے باغ کا مالی اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے تاکہ جن پودوں کی اسے ضرورت ہے انکی نشوونما میں رکاوٹ پیدا نہ ہو، مثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض ما لھا من قرار، اس کے برعکس تصور کامل کی محبت دائمی اور لازوال ہوتی ہے جو برابر ترقی کرتی رہتی ہے اور اسکی محبت میں کسی مایوسی یا ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، ومن یکفر

بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لہا، لہذا باقی تصورات مٹ جائیں گے اور تصور کامل دنیا میں باقی رہ جائے گا اور اس کی شان وشوکت تمام دنیا کا احاطہ کرے گی وہ ایک پائیدار اور پھلدار درخت کی طرح ہے جسے بڑھنے اور پھولنے کا موقعہ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتے لگتی ہیں اور اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں جم جاتی ہیں۔ اس کا بونے والا اس کے پھل سے کبھی مایوس نہیں ہوتا، ومثل کلمۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء تؤتی اکلہا کل حین باذن ربہا، ومن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لہا (۳) چونکہ غلط تصورات بہت سے ہو سکتے ہیں لہذا اگر نوع بشر تعلیم نبوت سے انحراف کریگی تو ضروری بات ہے کہ وہ ٹکڑوں میں بٹ جائیگی، قل ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ، پھر چونکہ ہر تصور کو ماننے والے اپنے تصور کو حسن وخوبی کی انتہا سمجھتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے تصورات کی قیمت پر اسے ترقی اور فروغ حاصل ہوتا رہے لہذا ہر تصور دوسرے تمام تصورات کا پنہاں یا آشکار دشمن ہوتا ہے اس وقت دنیا میں یہی صورت حال پیدا ہے ہر قوم اپنے تصور کی ترقی اور ترفع کے لئے دوسری قوموں کے مقابل میں صف آرا ہے دو عالمگیر جنگوں کی ہولناک تباہیوں کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد قومیں تصورات کی فطرت سے مجبور ہو کر ایک اور عالمگیر جنگ میں کودنے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ جو ممکن ہے کرۂ ارض سے انسان کو نیست ونابود ہی کر دے۔ انبیاء کی تعلیم کی طرف رجوع کرنا اس خطرناک صورت حال کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ عقیدہ توحید ایک بیج ہے اور اسلام وہ درخت ہے جو اس بیج سے پھوٹا اور بڑھا اور پھولا ہے اسلام کے باقی تمام عقائد مثلاً اطاعت نبوت کی ضرورت جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، ذکر و فکر

کی ضرورت عمل صالح کی ضرورت، عمل کی جزا اور سزا کا اعتقاد سیاسی آزادی کا اعتقاد جہاد کی تبلیغ اور اخوت سب عقیدۂ توحید ہی کی شاخیں ہیں در اصل اسلام کا کوئی عقیدہ یا اس سے پیدا ہونے والا کوئی عمل ایسا نہیں جو عقیدہ لا الٰہ الا اللہ سے الگ کوئی حیثیت یا اہمیت رکھتا ہو۔ اسلام کے سارے عقائد اسی عقیدہ سے ماخوذ اور اسی کے تابع ہیں اور اسی کی تائید و توثیق اور توسیع کے لئے اپنا وجود رکھتے ہیں۔ جو شخص خدا کی الوہیت کا اقرار کرتا ہے وہ یہ بھی مانتا ہے کہ اس کے سوائے کوئی نہیں جو صفات جمال کا مالک ہو، وہی ہے جو حی و قیوم ہے کائنات کا خالق ہے، رب اور رحمان اور رحیم اور کریم ہے رازق ہے عادل ہے اور دوسروں کا رحم، ربوبیت، عدل، قدرت، رزاقیت اور خالقیت، اور تمام صفات جمال، جس حد تک وہ ان میں موجود ہیں اسی کی صفاتِ جمال کا پرتو ہیں۔ خدا کی صفات جمال میں محبت کی صفت ایک مرکز کی طرح ہے جس کے گرداگرد، جس کے ماتحت اور جس کی خدمت اور اعانت کے لئے اس کی باقی تمام صفات جمال اظہار پاتی ہیں حق تعالیٰ کی صفت محبت کو قرآن نے رحمت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے، (کتب علی نفسہ الرحمۃ (ترجمہ) اس نے اپنے آپ پر محبت کو فرض کر لیا ہے، وسعت رحمتی کل شیء، (ترجمہ) میری محبت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے لئے "الرحمٰن" کا نام پسند کرتا ہے جس کے معنی ہیں عام رحمت کرنے والا، خدا کی محبت انسان کے لئے ہے اور وہ توقع رکھتا ہے کہ انسان بھی اسی سے محبت کرے اس لئے انسان کی تخلیق اس طرح سے کی ہے کہ اس کی اپنی صفات کی طرح انسان کی صفات کا مرکز بھی محبت ہی کو بنایا ہے اس محبت کی صفت کی وجہ سے انسان خدا کی باقی صفات سے جو محبت کی موید اور معاون ہیں

حصہ لیتا ہے۔ حدیث کے الفاظ، ان اللہ خلق اٰدم علیٰ صورتہ کا مطلب یہی ہے اپنی فطرت کے اندر صفاتِ ربانی کا پرتو رکھنے کی وجہ سے ہی انسان خدا کا خلیفہ قرار پایا ہے انسان کا فطرتی جذبہ محبت، صرف خدا کی محبت اور عبادت سے مطمئن ہوتا ہے اور خدا کی عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان جس حد تک کہ اس کے لئے ممکن ہو اپنے آپکو خدا کے اوصاف کے ساتھ متصف اور اس کے اخلاق کے ساتھ متخلق کرے اس راہ میں وہ جس قدر زیادہ ترقی کرے گا۔ اسی قدر خدا کی محبت اور نیابت کا اہل ہوگا۔

احساسِ جمال خدا کی صفات جمال پر ایمان لانے سے انسان کے دل میں حسن کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کی عبادت کی ابتدا ہوتی ہے، معبود وہی ہوسکتا ہے جو محبوب بھی ہو اور محبوب وہی ہوسکتا ہے۔ جس کے اندر صفاتِ حسن بدرجہ کمال موجود ہوں کیونکہ حسن ہی ہے جو انسان کے اندر محبت کا جذبہ پیدا کرسکتا ہے جو اس کا سر کسی محبوب کے سامنے جھکا سکتا ہے۔ تمام حسن، حسن معنوی ہے اور اس کا مالک فقط اللہ ہے۔ خدا کو اس سے بحث نہیں کہ لوگ خدا کا ذاتی نام کیا قرار دیتے ہیں اُسے اللہ کہتے ہیں یا برہم یا گاڈ، وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی صفات پر ایمان لایا جائے قرآن کی اصطلاح میں صفات جمال کو اسمائے حسنٰی "کا نام دیا گیا ہے، قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایاما تدعوا فلہ الاسماء الحسنٰی — لہ الاسماء الحسنٰی فادعوہ بہا۔ خدا کی صفات جمال میں اس کی صفات جلال، یعنی قہر غصہ اور انتقام کی صفات بھی شامل ہیں کیونکہ یہ صفات بھی اس کی مرکزی صفت محبت کے ماتحت ہی ظہور پذیر ہوتی ہیں جمال بغیر جلال کے مکمل نہیں ہوتا محبت کی تکمیل کیلئے نفرت اور تعمیر کی تکمیل کیلئے تخریب ضروری ہے۔ محبت کا ایک پہلو یہ ہے، کہ

اس کے نقیض سے نفرت کی جائے، نیکی سے محبت وہی کرتا ہے۔ جو بدی سے نفرت کرتا ہو، انصاف وہی قائم کر سکتا ہے جو بے انصافی کا قلع قمع کرنے کیلئے تیار ہو۔ رحم وہی کر سکتا ہے جو ظلم کو برداشت نہ کرے۔ چونکہ صفاتِ جلال مقاصد محبت کی تکمیل کے لئے ظہور میں آتی ہیں، لہذا وہ بھی محبت کا ایک حصہ ہیں، خدا کی محبت انسان کی تعمیر اور تربیت کرتی ہے۔ اور اس کی نفرت اس تعمیر اور تربیت کی رکاوٹوں کو دور کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہے" ولنذیقنھم من العذاب الادنٰی دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون (ترجمہ) اور بیشک ہم انہیں بڑے عذاب سے پہلے ایک چھوٹا عذاب چکھائیں گے تاکہ وہ باز آئیں۔ جب عذاب کی وجہ سے انسان کے اندر خدا کی تخلیق تعمیر اور تربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو عذاب اس سے روک لیا جاتا ہے اور اُسے رحمت و ربوبیت کے دائرہ میں داخل کر لیا جاتا ہے خدا کے عفو کا مطلب یہی ہے۔ خدا کی صفتِ عفو، خود بتا رہی ہے کہ اس کا عذاب، عذاب کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ انسان خدا کی رحمت ربوبیت اور محبت کی طرف عود کرے۔ خدا کی صفات جمال، اس کی اصلی، اور بنیادی صفات ہیں اور صفاتِ جلال، ان کی مؤید اور معاون۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں حق تعالیٰ کی صفات کی مجموعی نوعیت کا ذکر کیا ہے۔ وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کے اسماء، اسماء حسنٰے ہیں یعنی وہ نام جن میں حسن ہے اور جو کشش کرنیوالے ہیں خدا کے جمال کے اندر جلال ہے اور جلال کے اندر جمال، اس کی ذات میں جلال، اور جمال ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ جلال کے بغیر، نہ تو جمال کا ظہور مکمل ہوتا ہے اور نہ اس کی معرفت خدا نے انسان کو اپنی صفات جلال سے اُسی طرح حصہ دیا ہے جس طرح اپنی صفات جمال سے کیونکہ انسان کی محبت بھی صفات جلال کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ خدا کی عبادت یا محبت انسان کی جمالی اور جلالی صفات کو اس کی استعداد کے

مطابق کمال پر پہنچاتی ہے۔ اگر انسان خدا کی صفات جمال اور جلال دونوں سے بہرہ ور نہ ہو تو وہ خدا کی نیابت کے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ نوع انسانی کی تربیت اور ترقی کے لئے اس کے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہے اور یہ وہی کام ہے جو خدا اپنے نائب مرد مومن کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ یریدُ اللہ لیعذبھم بایدیکم۔ یہی جہاد ہے جہاد مرد مومن کی صفات جلال کا ظہور ہے جس سے اس کی صفات جمال کے ظہور کے لئے راستہ صاف ہوتا ہے۔ بہائیت نے جو سب سے بڑی گمراہی انسانوں میں پھیلائی ہے وہ یہی ہے کہ اب انسان کو صفت جلالی کی ضرورت نہیں، کیا اب انسان کی روحانی ترقی اپنے کمال پر پہنچ گئی ہے کیا اب نیکی کے راستے میں کوئی رکاوٹیں باقی نہیں رہا اگر رکاوٹیں موجود ہیں تو کیا خدا نے ان رکاوٹوں سے صلح کر لی ہے۔ کہ اس کا عبد اور اس کا نائب انسان بھی ان سے صلح کرلے۔ کیا باطل نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، کہ اب حق کو غیر مسلح کرنے کی ضرورت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ صفات جلال انسان کی فطرت کا ایک ابدی اور ازلی جزو ہیں انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا، لا تبدیل لخلق اللہ۔ جب تک دنیا کمال کو نہیں پہنچتی، خدا اور انسان کی جلالی صفات کا اظہار ہوتا رہے گا اور جب کمال پر پہنچے گی تو خدا اس دنیا کو فنا کر کے نئی دنیا بنا لے گا تاکہ اس کی صفات جمال و جلال کا اظہار برابر ہوتا رہے۔ زندگی، جدوجہد کا نام ہے اور یہ باطل کے خلاف حق و صداقت کی جدوجہد ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص برائی کو دیکھے تو اُسے اپنے ہاتھ سے روکے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے ورنہ فقط دل ہی سے بُرا سمجھے، اور یہ کمزور ترین ایمان کی علامت ہے یعنی صفات جلالی کا ادنیٰ مظاہرہ ہے۔ من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ وان لم یستطع فبلسانہٖ وان لم یستطع فبقلبہٖ وذالک اضعف الایمان ۝

عقیدہ توحید کے قبول کرنے یعنی خدا کی صفاتِ حسن کا اقرار کرنے سے انسان کے اندر جو حُسن کا احساس پیدا ہوتا ہے اس کو علم یا ایمان یا حب اللہ یا معرفتِ حق کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر احساس کی طرح یہ احساس بھی عمل میں اپنا اظہار چاہتا ہے اور جوں جوں ہم اپنے عمل میں اس کا اظہار کرتے جاتے ہیں اس احساس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ احساس اپنے کمال پہ پہنچ جاتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے اور یہ ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی لئے قرآن میں جہاں "آمنوا" کہا گیا ہے وہاں "عملوا الصلحت" بھی ساتھ ہی کہدیا گیا ہے۔ کیونکہ عمل صالح یعنی خدا کی محبت کے ماتحت عمل کرنا، ایمان یا حب اللہ کی صرف ایک ہی علامت ہے جس کے بغیر، اندرونی وصف ایمان یا احساسِ حسن کی کوئی علامت ہمارے پاس موجود نہیں ہوتی عمل کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک ١، مطالعہ جمال، یعنی خدا کی صفاتِ حسن پر غور و فکر، اور دوسری ٢ اظہارِ جمال، یعنی اپنے اخلاق کے اندر، صفاتِ حسن کا ظاہر کرنا عمل کے یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ممد و معاون ہیں اور مل کر انسان کی محبت کو درجۂ کمال پہ پہنچاتے ہیں۔

مطالعۂ جمال

مطالعہ جمال، صفاتِ جمال کی علامات کے ذریعہ سے ہوتا ہے ہر انسان کی زندگی میں مطالعہ جمال کی اولین ابتدا مظاہر قدرت پر غور و فکر کرنے سے ہوتی ہے کیونکہ کائنات خدا کا فعل ہے اور خدا کی صفات کمال اس کے اندر اسی طرح سے ظہور پذیر ہیں جس طرح ایک مصور کے شاہکار میں اس کا کمالِ ہنر جلوہ گر ہوتا ہے۔ مظاہر قدرت پر غور و فکر سے انسان کا چارہ نہیں کیونکہ انسان چاروں طرف ان سے گھرا ہوا ہے ؎

نگہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں — کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

لہٰذا ہر انسان مجبوراً صفاتِ جمال سے ایک ابتدائی تعارف پیدا کرتا ہے اسی سے اس کے ایمان یا احساسِ حسن کا آغاز ہوتا ہے جس کیلئے اُس کی فطرت کے اندر ایک مناسبت موجود ہے۔

مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری　　وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبورِ پیدائی

لیکن اکثر بدقسمت انسان اس احساس کے مناسب اظہار کی راہ نہیں پاتے، یا راہ پانے کے بعد اس راہ کو دیدہ و دانستہ اختیار نہیں کرتے اور اس طرح سے اس احساس کو جو خدا کی ہستی کے اعتراف کے مترادف ہوتا ہے کچل ڈالتے ہیں، تاہم چونکہ اس احساس کی صداقت کی دلیل انسان کی فطرت کے اندر موجود ہوتی ہے اور یہ احساس اسے فطرتاً مرغوب ہوتا ہے، اس لئے کلیۃً کچلا نہیں جاتا بلکہ انسان کے تحت الشعور میں دب کر رہ جاتا ہے، دہریت جہاں ہو فقط زبان پر ہوتی ہے دل میں نہیں ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ جب ایک منکرِ خدا مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ غلط تصورات کی محبت اُسے فائدہ نہیں دے سکتی۔ پھر وہ جھوٹے خداؤں کو چھوڑ دیتا ہے اور سچے خدا کو پکارتا ہے، فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین فاذا نجاھم الی البر فمنھم مقتصد، خدا کے انبیا جب آتے ہیں تو وہ کوئی نئی بات نہیں کہتے بلکہ انسان کے اسی کچلے ہوئے اور دبے ہوئے احساس حسن کو پھر زندہ کرتے ہیں اور اس کے اظہار کی صحیح راہ اس کو بتاتے ہیں چنانچہ ان کی تعلیم کا آغاز مطالعہ قدرت کی دعوت سے ہوتا ہے وہ انسانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ صحیفہ قدرت پر غور و فکر کرو، کیا وہاں تمہیں خدا کی خالقیت، رحمت، ربوبیت اور جملہ صفات حسن کا پرتو عیاں طور پر نظر نہیں آتا اور تم اس کا اعتراف نہیں کرتے، خدا وہی ہے جو ان صفات حسن کا مالک ہو، ذالکم اللہ ربکم انی تؤفکون ــــ قل من یرزقکم من السماء ــــ قل ارأیتم ان اصبح ماءکم غوراً فمن یاتیکم بماء معین۔ قرآن نے ان مسلمانوں کو سراہا ہے جو کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ اس عمل سے انسان کا احساس حسن بیدار ہی نہیں ہوتا بلکہ ترقی کرتا اور قوی تر ہوتا ہے، والذین یتفکرون فی خلق السموات والارض، قرآن نے خود مناظر قدرت میں سے ایک ایک کی طرف انسان کو توجہ دلائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ وہ غور کرے کہ کس طرح یہ مظاہر خدا کی صفاتِ جمال و جلال کے آئینہ دار ہیں اور کیونکر انسان کو خدا کی معرفت کا ایک فصیح و بلیغ درس دے رہے ہیں، فانظر الی آثار رحمت اللہ کیف

یحیی الارض بعد موتہا ان فی ذالک لمحی الموتیٰ وھو علی کل شیئ قدیر، ھو الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناءً وانزل من السماء ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض ان فی ذالک لاٰیٰت لقوم یعقلون، اللہ الذی یرسل الریٰح فتثیر سحابا فیبسطہ فی السماء کیف یشاء ویجعلہ کسفا فتری الودق یخرج من خللہ فاذا اصاب بہ من یشاء من عبادہ اذا ھم یستبشرون، یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ویحی الارض بعد موتہا وکذالک تخرجون ۰ ومن اٰیٰتہ ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون ۰ ومن اٰیٰتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ان فی ذالک لاٰیٰت لقوم یتفکرون ۰ ومن اٰیٰتہ خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ۰ ان فی ذالک لاٰیٰت للعٰلمین ۰ ومن اٰیٰتہ منامکم بالیل والنھار وابتغاؤکم من فضلہ ان فی ذالک لاٰیٰت لقوم یسمعون ۰ ومن اٰیٰتہ یریکم البرق خوفا وطمعا وینزل من السماء ماء فیحیی بہ الارض بعد موتہا ۰ ان فی ذالک لاٰیٰت لقوم یعقلون، افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الارض کیف سطحت، اللہ الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ۰ ھل من شرکائکم من یفعل من ذالکم من شیئ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون، صفات جلال کے نشانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبل۔ کان اکثرھم مشرکین؛

اس قسم کے مطالعہ جمال میں انسان اپنے احساس حسن کو بیدار کرنے اور ترقی دینے کے لئے مظاہر قدرت کو جو قوانین قدرت کے تابع رونما ہوتے ہیں، خدا کی صفات کی علامات کے طور پر کام میں لاتا ہے۔

لیکن جب مومن کا احساس حسن ذرا ترقی کر جاتا ہے تو پھر اسے مزید ترقی دینے کے لئے وہ ایک اور قسم کی علامات کو بھی کام میں لاتا ہے اور وہ الفاظ کی علامات ہیں جنہیں قرآن حکیم

سے اسمائے حسنیٰ کہا ہے ان الفاظ کے معانی پر غور و فکر کرنے اور ان پر اپنی توجہ مرکوز کرنے سے مومن کی محبت صفات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مطالعہ جمال کا دوسرا طریق ہے اور اسے ذکر کہتے ہیں۔ اس کی اصل بھی صفاتِ جمال پر غور و فکر ہے۔ زبان سے اسمائے حسنیٰ کا نام لینا یا ذکر کرنا ان پر غور و فکر کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے چونکہ اسمائے حسنیٰ سب کے سب مدح و ستائش کے نام ہیں لہذا ذکر محبوب کی مدح و ستائش اور اس کی عظمت و جلال اور کبریائی کے اعتراف اور اقرار کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ستائش حسن اگرچہ احساس حسن کے اظہار ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور احساس حسن کا نتیجہ ہے لیکن یہ ایک ایسا فعل ہے جو خود احساس حسن کی کیفیت کو بدلتا جاتا ہے اور اسے ترقی دیتا اور عمیق تر اور قوی تر کرتا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے اوصاف حسن پر توجہ مرکوز ہوتی ہے اور ان پر غور و فکر کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوصاف باری تعالیٰ کی خوبی اور جمال سے اور پردے اٹھ جاتے ہیں ان کا حسن اور نمایاں ہو جاتا ہے اور ان کی محبت اور معرفت بڑھ جاتی ہے، ذکر کا مقصد حسن کی ستائش ہے جو دراصل انسان کے ضمیر کا فعل ہے اور محض اس کی زبان کا فعل نہیں۔ ذکر انسان کے دل کی کیفیت کا نام ہے، اس کی زبان کی کیفیت کا نام نہیں۔ اگر ذکر صفات حسن پر غور و فکر کے بغیر ہے تو وہ جستجوئے جمال کی مخلصانہ کوشش نہیں اور اس سے افزائش محبت کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ذکر کی ایک خاص صورت وہ ہے جسے صلوٰۃ یا نماز کہا جاتا ہے اور جو ہم پر دن میں پانچ وقت فرض قرار دی گئی ہے۔ نماز ذکر و فکر کی بنیاد قائم کرتی ہے اور اس کے ذوق و شوق کی پرورش کرتی ہے، جب ذکر فکر کا ہمدوش ہو یعنی جب وہ سچے احساس حسن کا نتیجہ ہو اور انتہائی اخلاص پر مبنی ہو تو اس میں خشوع اور خضوع، محبت اور فریفتگی اور عجز و انکسار کے عناصر موجود ہوتے ہیں سچی محبت کرنے والا ہمیشہ خوف و رجا کے درمیان رہتا ہے اس لئے حضورؐ نے فرمایا:۔ الایمان بین الخوف والرجاء، اسے خوف تو اس بات کا ہوتا ہے کہ مبادا محبوب کی محبت اس سے چھن جائے وہ کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھے جس کا نتیجہ اس کی ناراضگی ہو اور اسے

محبوب کی ناراضگی کا ڈر، اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ اسے کوئی سزا دے گا۔ بلکہ وہ خود اس کی ناراضگی کو ہی سب سے بڑی سزا سمجھتا ہے، یہی اس کی دوزخ ہے اور اُسے امید اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کی محبت اور اطاعت محبوب کی مزید رضامندی کا موجب ہوگی اور وہ اسکی رضامندی کا طالب اس لئے نہیں ہوتا کہ اُس سے کوئی انعام حاصل کریگا، بلکہ وہ خود اُس کی رضامندی کو ہی سب سے بڑا انعام سمجھتا ہے۔ یہی اس کی جنت ہے۔ ورضوانٌ من اللہ اکبر لو کانوا یعلمون خدا کی رضامندی آنکھوں کی وہ ٹھنڈک ہے، جس کی لذت کا اندازہ ہم اس وقت نہیں کرسکتے وما تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین، حدیث میں ہے کہ جنت میں شہدا خدا سے التجا کریں گے کہ اے خدا ہمیں دنیا میں پھر بھیج تاکہ ہم تیری راہ میں پھر شہید ہوں اور تو ہم پر خوش ہو، اہل جنت کو جنت میں داخل ہوتے ہوئے جس نعمت کی بشارت دی جائے گی وہ یہ ہوگی کہ خدا اُن سے راضی ہے، یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی،

عبادت میں عجز و انکسار، جو قربِ حسن کی آرزو سے پیدا ہوتا ہے، مومن کی خودداری کو شکستہ نہیں کرتا، بلکہ اُسے قائم کرتا ہے کیونکہ جس قدر وہ عجز کرتا ہے، اسی قدر اسے معبود کی عظمت اور کبریائی کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اس معرفت کی وجہ سے وہ خود محبوب کی کبریائی سے حصہ لیتا ہے اور اس کی خودداری اور خود اعتمادی ترقی کرتی ہے۔ مومن اللہ کے سامنے سرنگون ہوتا ہے، لیکن غیر اللہ کے سامنے سرکش، کیونکہ اسے اپنی اس طاقت کا علم ہوتا ہے جسے وہ محبوب کی دوستی سے حاصل کرتا ہے ؎

خویش را در بازو خود را باز گیر   دام گستر از نیاز و ناز گیر

خدا کی حمد و ستائش، تحسین و تسبیح، تقدیس و تہلیل ذکر کی صورتیں ہیں صرف وہی ذکر جو سچے احساس حسن کا نتیجہ ہو۔ یعنی جس میں خشوع و خضوع، تضرع اور ابتہال سوز و گداز اور بیم و رجا کے عناصر موجود ہوں، مومن کے احساس حسن کو عمیق تر اور قوی تر کرتا ہے اور اس

کی محبت اور معرفت کو ترقی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہم سے عبادت میں اخلاص طلب کرتا ہے اور فقط زبان سے چند کلمات کا تکرار طلب نہیں کرتا۔ لا یاتون الصلوۃ الا وھم کسالیٰ ولا ینفقون الا وھم کارھون ــــ فاعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین ــــ فادعوا اللہ تضرعا و خیفۃ ــــ قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون ــــ الذین یدعون ربھم رغبا و رھبا وکانوا لنا خاشعین، حسن عبادت جس کا ذکر حضورؐ کی اس دعا میں ہے، اللھم اعنا علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک یہی عبادت ہے جس میں اخلاص موجود ہو۔ محبت کی ترقی کا انحصار مخلصانہ عبادت میں ہے اور خدا کے نزدیک سچا مومن وہی ہے جو خدا سے شدید محبت رکھتا ہے، والذین امنوا اشد حبا للہ ان آیات سے مخلصانہ عبادت کی ضرورت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے، اگر ہم اس قسم کی شدید محبت جو ایک سچے مومن کا امتیاز ہے پیدا کرنے سے قاصر رہ جائیں تو پھر ہم وہ کام بھی نہیں کر سکتے جو خدا کے نائبوں کی حیثیت سے ہمارے سپرد کیا گیا ہے یعنی تربیت انسانیت ونکتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ اس قسم کی شدید محبت ہی ہماری اپنی اصلاح کی ضمانت ہے اور ہمیں دوسروں کی اصلاح کی خاطر قربانیاں کرنے کیلئے آمادہ کر سکتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں ہم خدا کی محبت کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وہ ہمیں زندہ رہنے کا حقدار بھی نہیں سمجھتا اور اس بات پر آمادہ ہے کہ ہمیں مٹا کر ہماری جگہ کوئی اور قوم دنیا میں لے آئے، جو اس سے محبت کرتے ہوں اور جن سے وہ محبت کرتا ہو۔ یا ایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔

احساس حسن میں ایک خاص قسم کی لذت ہوتی ہے، جوں جوں ذکر و فکر سے مومن کا احساس حسن ترقی کرتا ہے، یہ لذت بڑھتی جاتی ہے۔ اس سے مومن کا یقین اور اطمینان

قلب اور ترقی کرتا ہے۔ اس لذت اور اطمینان قلب سے مومن صراط مستقیم کا ذاتی تحقق اور اس کی دلی تصدیق کرتا ہے اور اس پر قائم رہتا ہے، الذین امنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب، خدا کے ذکر سے مومن کو جو غیر معمولی اطمینان قلب اور سرور حاصل ہوتا ہے وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کا ذکر انسان کی ایک شدید فطرتی ضرورت کو پورا کرتا ہے قدرت نے انسان کی ہر فطرتی ضرورت کی تکمیل میں ایک لذت رکھی ہے خواہ وہ ضرورت حیاتیاتی سطح پر ہو یا نفسیاتی سطح پر یہ لذت ضرورت کی تکمیل کے لئے راہنمائی کرتی ہے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر و فکر کی ایک قلیل ترین صورت نماز کی شکل میں معین فرما دی ہے لیکن محبت کے کمال یا روحانی ارتقاء کے بلند ترین مقامات تک پہنچنے کیلئے جو در حقیقت مومن کا مقصود ہے جس قدر ذکر و فکر کی ضرورت ہے وہ سب کا سب نماز سے میسر نہیں آتا۔ اس لئے مومن کیلئے ضروری ہے کہ نماز کے علاوہ بھی کثرت سے ذکر و فکر میں مشغول رہے ورنہ وہ اپنے مقصود کو نہیں پا سکے گا، فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون ـــ الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم ـــ فاذکروا اللہ کذکرکم اباءکم او اشد ذکراً۔

اظہار جمال احساس حسن سے جو عمل پیدا ہوتا ہے اس کی دوسری قسم اظہار جمال ہے یعنی اپنے اخلاق میں حق تعالیٰ کی صفات کا اظہار کرنا خدا کی ربوبیت کا اقرار، مومن کو خدا کی حمد و ستائش پر ہی مائل نہیں کرتا بلکہ اس کی زندگی کے ہر فعل کی نوعیت کو معین کرتا ہے۔ نماز اور ذکر اور فکر کے ذریعہ سے مومن اپنے احساس حسن کے عملی اظہار کا ایک طریقہ اختیار کرتا ہے لیکن اسی احساس حسن سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اس کا اظہار ایک طریق سے نہیں بلکہ ہر ممکن طریق سے کرے۔ پس وہ اپنے شب و روز کے سارے اعمال و افعال میں بھی اس کا اظہار کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اوصاف باری تعالیٰ کے حسن سے آشنا ہی نہیں اور اس کے دل میں ان کے

جمال کا احساس یا ان کی کشش موجود ہی نہیں کیونکہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص رحم، ربوبیت محبت، انصاف، صداقت، غیرت وغیرہ اوصاف کے حسن کا احساس تو رکھتا ہو لیکن اپنے فعل و کردار میں انصاف کی بجائے بے انصافی ربوبیت کی بجائے استیصال رحم کی بجائے ظلم، محبت کی بجائے نفرت، صداقت کی بجائے جھوٹ اور غیرت اور حمیت کی بجائے بے غیرتی اور بے حمیتی کو اپنا شعار بنائے جو شخص خدا کے اوصاف سے محبت رکھتا ہے، ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام افعال میں ان کا اظہار کرے جب وہ ایسا کرتا ہے تو ان اوصاف کی محبت اور معرفت میں اور ترقی حاصل کرتا ہے کیونکہ یہ نفسیات انسانی کا ایک اٹل قانون اور فطرت انسانی کا ایک ذاتی تقاضہ ہے کہ ہر احساس اظہار سے قوی تر ہوتا ہے اور اظہار کے بغیر اور کمزور ہو جاتا ہے۔ جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کے لئے دوسری نیکی کرنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے ایک ظالم انسان اگر ایک دفعہ انصاف کی طرف رغبت کرے تو دوسری دفعہ انصاف کی طرف مائل ہونا اس کے لئے اور بھی آسان ہو جاتا ہے جو شخص احساس حسن سے بہرہ ور ہے اور ذکر و فکر کے ذریعہ سے اس کا اظہار کرتا ہے لیکن اپنے دن رات کے سارے اعمال و افعال میں اس کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دن بھر میں ایک دو گھنٹے تو اپنی منزل مقصود کی طرف قدم اٹھائے لیکن باقی تمام دن مخالف سمت میں چلتا رہے وہ کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچے گا بلکہ ہمیشہ اس سے دور تر ہوتا جائے گا۔ پس ضروری ہے کہ خدا کو محبوب اور معبود تسلیم کرنے کے بعد مومن کا سارا عمل اُن اخلاقی اصولوں کے تابع ہو جائے۔ جو خدا کی صفات جمال و جلال سے ماخوذ ہیں۔

اخلاقی اصولوں کی ایسی پیروی کہ اس میں کسی غلطی یا لغزش کا امکان باقی نہ

رہے، ابتدا ہی سے ممکن نہیں ہوتی، بلکہ اس وقت ممکن ہوتی ہے، جب مومن کی محبت ترقی کرکے اپنے کمال پر پہنچ جائے، ذکر و فکر کی کثرت سے جب مومن کی محبت میں کچھ اضافہ ہوتا ہے تو اس ترقی یافتہ محبت کی وجہ سے اخلاقی اصولوں کی پیروی اس کے لئے کچھ اور آسان ہو جاتی ہے اور اس کے عمل میں کچھ اور حسن کچھ اور پاکیزگی اور شستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کا عمل اسے صفاتِ حسن کے اور قریب لے آتا ہے اور اس کے احساس حسن کو عمیق تر اور قوی تر بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ ذکر اور فکر میں مشغول ہوتا ہے تو اسے اس میں پہلے سے بھی زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے اور یہ ذکر و فکر چونکہ اس کی ترقی یافتہ معرفت جمال کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اس کی محبت اور معرفت کی ترقی کے لئے اور بھی زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے، محبت کی یہ ترقی اس کے عمل میں اور عمدگی پاکیزگی اور پختگی پیدا کرتی ہے، اس طرح سے حسن اخلاق اور ذکر و فکر، دونوں ایک دوسرے کی تائید اور اعانت کرتے ہوئے مومن کی محبت کو نقطۂ کمال پر پہنچاتے ہیں۔

جب مومن کی محبت اپنی انتہا کے قریب پہنچتی ہے تو اس کا سرور یا اطمینان قلب بھی اپنی انتہا کے قریب پہنچ جاتا ہے، اسی سرور یا اطمینان قلب سے مومن کی جنت کا آغاز ہوتا ہے، اپنے اطمینان قلب کی آخری منزلوں پر پہنچنے کے بعد جب مومن ذکر و فکر میں مشغول ہوتا ہے تو اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ خداوند تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے یہ وہی درجۂ احسان ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے، "ان اللہ یحب المحسنین" اور جس کا ذکر حضورؐ نے ان الفاظ میں فرمایا تھا، "الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ" جس قدر مومن کی محبت زیادہ ہوگی، اُسی قدر اس کا نظارۂ جمال بھی واضح اور روشن اور باعث ازدیاد لذت و سرور ہوگا۔

مومن جب اپنی محبت کے کمال پر پہنچ جاتا ہے تو اپنے جذبۂ محبت کو اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ خلقت کی اصلاح کے لئے کام میں لاتا ہے کیونکہ شدتِ محبت ایک بے پناہ قوتِ عمل ہے جو رُک نہیں سکتی اور جو لازماً اپنے اظہار اور استعمال کے لئے میدانِ عمل تلاش کرتی ہے اور اس کا میدان اس کے سوائے اور کوئی نہیں ہوتا کہ مومن خدا سے برگشتہ انسانوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے اس غرض کے لئے وہ اپنی صفاتِ جمال و جلال کو جو خدا کی صفات جمال و جلال کا پرتو ہوتی ہیں کام میں لاتا ہے جہاں تک ہو سکے وہ محبت اور نرمی سے کام لیتا ہے لیکن جب ضرورت پڑے تو نفرت اور سختی کا برتاؤ بھی کرتا ہے چونکہ وہ خدا کی صفات سے متصف اور اس کے اخلاق سے متخلق ہوتا ہے وہ ان صفات کو اسی طرح سے کام میں لاتا ہے جس طرح خود خدا اپنی صفات کو کام میں لاتا ہے اسی لئے وہ خدا کا نائب اور خلیفہ قرار پاتا ہے وہ خدا کی تخلیق اور تربیت کا آلۂ کار بنتا ہے اور خدا کی تخلیق اور تربیت اس کی تخلیق اور تربیت کا جامہ اوڑھتی ہے، وکنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر اور خدا کی تعذیب اور سزا اس کی تعذیب اور سزا کا روپ دھارتی ہے، وما رمیت اذ رمیت ولٰکن اللہ رمیٰ۔ یہ یداللہ یعذبھم بایدیکم، انسانیت کی خدمت اور تربیت کے کام سے مومن کی محبت اور ترقی کرتی ہے یہاں تک کہ وہ پوری طرح پختہ اور راسخ ہو جاتی ہے۔

کیا خدا کو دیکھنا ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ہمیں رویت کی حقیقت پر غور کرنا چاہیئے جب ہم کسی مادی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس چیز پر نظر ڈالنے اور رویت کا احساس کرنے تک جو عمل معرضِ وجود میں آتا ہے وہ حسبِ ذیل ہے چیز سے جو روشنی کی شعاعیں بکھر رہی ہوتی ہیں وہ ہماری آنکھوں پر پڑتی ہیں ہماری

آنکھوں کا محدّب شیشہ انہیں سمیٹ کر چیز کا ایک عکس بناتا ہے جس کی اطلاع عصب رؤیت کے ذریعہ سے دماغ تک پہنچتی ہے اور دماغ کی معرفت ہمارے شعور کو اس چیز کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے گویا جو چیز خارج میں موجود کسی جسم کو دیکھتی ہے وہ دراصل ہمارا شعور ہی ہے اور ہمارا شعور بھی جو چیز دیکھتا ہے وہ خود جسم نہیں ہوتا بلکہ اس جسم کے چند اوصاف ہوتے ہیں، جن کے مجموعہ کو ہی ہم وہ جسم قرار دیتے ہیں۔ دماغ، عصب رؤیت آنکھ اور روشنی فقط ان اوصاف کا علم حاصل کرنے کے آلات ہیں جن کو ہمارا شعور اپنے کام میں لاتا ہے۔ جب شعور کو ان اوصاف کا واضح علم حاصل ہو جاتا ہے تو خواہ وہ جسم آنکھوں کے سامنے رہے یا نہ رہے، شعور اگر چاہے تو اس کو پھر دیکھ سکتا ہے اور جس قدر شعور کا علم واضح ہوگا اسی قدر اس کی بلاواسطہ رؤیت جسم بھی واضح ہوگی۔ جب مومن کے دل میں مطالعہ جمال اور مظاہرہ جمال سے حق تعالیٰ کے اوصاف کی محبت درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو شدت محبت کی وجہ سے ذکر و فکر کے دوران میں مومن کی ساری توجہ ان اوصاف پر مرکوز ہو جاتی ہے، وہ اوصاف اس کے شعور پر چھا جاتے ہیں اور ان کا علم اس کے شعور پر پوری طرح سے حاوی ہو جاتا ہے، اس وقت مومن کا شعور حق تعالیٰ کو بالکل اس طرح سے دیکھتا ہے جس طرح سے اس دنیا کی کسی اور چیز کو دیکھنا اس کے لئے ممکن ہوتا ہے چونکہ یہ رؤیت ان آنکھوں سے نہیں، جو مادی اجسام کے دیکھنے کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر بنائی گئی ہیں۔ اس لئے حدیث کے الفاظ ہیں كانك تراه، گویا تو خدا کو دیکھ رہا ہے۔ یعنی وہ دیکھنا تو ہے، لیکن آنکھوں کے ذریعے سے عمل میں نہیں آتا۔ یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک ہم خدا کو رو برو نہ دیکھیں، ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ ایمان لانا خدا کو دیکھنے کی پہلی شرط تھی۔ اس کٹ حجتی کے لئے ان کو سزا دی گئی۔

مطالعہ اور مظاہرہ جمال سے مومن کی محبت کی تدریجی ترقی کی ایک لازمی

خصوصیت یہ ہے کہ جوں جوں اس کے دل میں تصور کامل کی محبت ترقی کرتی جاتی ہے۔ ناقص تصورات کی محبت اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب تصورات ناقصہ کی محبت بالکل مٹ جاتی ہے تو تصور کامل کی محبت اپنے کمال پر پہنچ جاتی ہے درحقیقت مومن کے سامنے سارا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ تصورات باطلہ کی محبت بالکل مٹا دے۔ خدا کے انبیاء کی تعلیم کا مقصد بھی یہی ہے کہ مومن کو اس کی اس جدوجہد میں امداد بہم پہنچائی جائے، غلط محبت کے مٹ جانے سے انسان کی فطرتی استعداد محبت صحیح اور کامل تصور کیلئے مہیا ہو جاتی ہے اور لہٰذا کامل تصور کی محبت فوراً اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے اگر غلط محبتیں دل میں موجود رہیں تو صحیح محبت کو یہ عروج کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر صحیح اور کامل تصور کی محبت ترقی نہ کرے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ابھی بعض غلط تصورات کی محبت مومن کے دل کے کسی گوشہ میں چھپی ہوئی موجود ہے اور ابھی وہ شرک میں مبتلا ہے ایسی حالت میں مومن کو اور زیادہ مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

آپ پوچھیں گے کہ تصورات ناقصہ کی محبت مومن کے دل میں کیوں موجود ہوتی ہے؟ اور کہاں سے آتی ہے؟ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ تصورات ناقصہ وہ تصورات ہیں۔ جو تصور کامل کے علم کی عدم موجودگی میں انسان کے دل پر غالب ہو جاتے ہیں اور اس کی فطرتی استعداد محبت کو جو درحقیقت تصور کامل کے لئے مخصوص ہے، اپنے کام میں لے آتے ہیں۔ انسان جو یوں گمراہ ہو جاتا ہے اپنے فطرتی جذبہ محبت کی تشفی کے لئے غلط تصور کو وہ تمام صفات جمال

منسوب کرتا ہے، جن کا مالک درحقیقت اللہ ہی ہے، لہٰذا وہ اس سے
اسی طرح محبت کرتا ہے جس طرح اُسے اللہ سے محبت کرنی چاہیئے، واتخذ
من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ چونکہ انسان کا تصور
حسن ہی اس کے سارے اعمال و افعال کو پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی
انسان کچھ عرصہ کے لئے ایک ناقص تصور کے ساتھ وابستہ رہے تو اس کی
محبت کے اثر کے ماتحت وہ جو کام کرتا ہے۔ اُس کی طرف رغبت کی ایک عادت
بنا لیتا ہے۔ غلط تصور سے غلط عادات پیدا ہوتی ہیں، جو غلط تصور کی
محبت کو قائم رکھتی ہیں۔ انسان اس بات کے باوجود کہ وہ فطرتاً نیکی، صداقت
اور حسن و جمال کا دلدادہ ہے، غلط تصور کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اس
کی وجہ یہ ہے کہ کوئی باطل تصور کلیۃً باطل سے نہیں بنتا، بلکہ ہر غلط تصور،
حق و باطل کی آمیزش سے بنتا ہے اور اس لئے باطل ہوتا ہے۔ اس میں ایک
شائبہ نیکی، صداقت یا کسی اور صفت جمال کا موجود ہوتا ہے۔ جس سے انسان
کی فطرت دھوکہ کھاتی ہے اور اُسے تصور کامل سمجھ کر قبول کرتی ہے، جب ایک
انسان خدا کی الوہیت کا اقرار کرتا ہے تو اس کا یہ اقرار ان تمام تصورات
باطلہ کے لئے موت کا پیغام ہوتا ہے جن سے وہ آج تک اپنی تمنائے حسن و کمال
کو بہلاتا رہا تھا۔ لیکن تصورات باطلہ جو اپنی پیدا کی ہوئی عادات کے اندر جڑ پکڑ
چکے ہوتے ہیں۔ آسانی سے اس کے دل کو خالی نہیں کرتے اور اس کی محبت کی استعداد
کو فوراً کلیۃً رہا نہیں کرتے کہ مومن اسے فی الفور تصور کامل کے لئے کام میں لا سکے پھر رفتہ
رفتہ ذکر اور فکر اور سعی عمل سے جوں جوں مومن کی حقیقی محبت ترقی کرتی ہے اس کے اندر نئی عادات
پیدا ہوتی ہیں جو صحیح ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے پرانی غلط عادات کا عمل رک جاتا ہے یہاں تک
کہ وہ کمزور ہو کر مٹ جاتی ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ نیک اعمال کو متواتر اور

باقاعدگی سے جاری رکھا جائے ۔ تاکہ انسان کو ان کی عادت ہو جائے اور
بُرے اعمال کو اور ان کے ساتھ بُرے تصورات کو قائم رہنے اور بڑھنے اور
پھولنے کا موقعہ نہ ملے ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
کہ اچھے اعمال وہ ہیں جنہیں باقاعدگی سے جاری رکھا جائے اور نماز کو
فرضِ موُقت بھی اسی لئے قرار دیا گیا ہے ، ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین
کتابًا موقوتًا ،

تصورات باطلہ کی غیر معمولی قوت کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اکثر
ہماری حیوانی جبلتوں ، حیاتیاتی سطح کی خواہشات یا نچلے طبقہ کی خواہشات کے
ارد گرد قائم ہوتے ہیں ، ہماری فطرت کی وہ قوت محبت جو تصور حسن و کمال کے
لئے مخصوص ہے ۔ جب ایک غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے تو اکثر حیوانی جبلتوں
کی تسلی اور تشفی کی لذت کو ہی حسن و کمال کی انتہا قرار دے لیتی ہے گویا ہماری
جبلتی خواہشات ہی ہمارے تصورات حسن کی صورت میں جلوہ افروز ہو جاتی ہیں
جب یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے تو انسان ان خواہشات کو ان کے فطرتی مقصد
یعنی بقائے فرد و نسل کی ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اپنی ساری
زندگی ان کی تسلّی اور تشفی کی لذت کے لئے مخصوص کر دیتا ہے ۔ اس سے کوئی
اعلیٰ تر تصور حسن اس کے ذہن میں نہیں آتا ، وہ کسی اعلیٰ تر تصور کے حسن کا
احساس کرنے کی اہلیت ہی کھو دیتا ہے ۔ انسان کی یہ زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی
ہوتی ہے ۔ انسانی درجہ کی زندگی نہیں ہوتی بلکہ ایسی صورت میں انسان حیوان
سے بدتر ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ حیوان اپنی جبلتی حیاتیاتی خواہشات کو کبھی ضرورت
سے زیادہ مطمئن نہیں کرتا ۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے ، ھم
کالانعام بل ھم اضل ، ایسے لوگوں کا خدا ، گویا ان کی سفلی خواہشات ہی ہیں

افرایت من اتخذ الٰہہٗ ھواہ۔ جب انسان کی جبلتی خواہشات اس کے تصورات جمال کا درجہ اختیار کرتی ہیں تو وہ اور بھی طاقت ور ہوجاتی ہیں کیونکہ وہ پھر انسان کی اُس محبت سے بھی قوت حاصل کرتی ہیں جو انسان کی فطرت میں تصورات کے لئے مخصوص ہے اس صورت میں تصور کامل کی محبت کی ترقی کے لئے ان کا مقابلہ کر کے ان کو اپنے دائرہ کے اندر محدود کرنا اور بھی مشکل ہوجاتا ہے تاہم مردمومن کی جدوجہد اس کو آسان بناتی ہے

مرد مومن زندہ و با خود بجنگ

بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

صوم یا روزہ کا فلسفہ یہی ہے کہ مومن اپنی محبت میں جبلتی خواہشات کی مداخلت کا مقابلہ کرنے کی مشق حاصل کرے اور بالآخر ان پر فتح پائے اور ان کو بقائے حیات کی ضرورت کے دائرہ تک محدود کر دے تاکہ وہ تجاوز کر کے تصور کی محبت سے حصہ نہ لیں۔ روزہ رکھنے سے ایک ٹریننگ حاصل ہوتی ہے جس سے تصور کامل کی محبت کے راستہ سے رکاوٹیں دور ہوتی ہیں اور وہ ترقی کر کے اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ تزکیہ نفس کے معنی یہی ہیں کہ انسان باطل تصورات کی محبت سے جس میں جبلتی خواہشات کی محبت بھی شامل ہے اپنے شعور کو پاک کرے۔ جب تک کہ شعور ان خواہشات سے پاک نہ ہوگا۔ محبت کی استعداد بے محل صرف ہوتی رہے گی۔ تصور کامل کی محبت اور معرفت کی ترقی رکی رہے گی۔ اور مومن کو مکمل اطمینان قلب حاصل نہ ہوگا۔ قد افلح من زکٰھا وقد خاب من دسّٰھا اور ونھی النفس عن الھوٰی فان الجنۃ ھی الماوٰی۔ یہی نہیں کہ جبلتی خواہشات تصور کی محبت چھین لیتی ہیں اور مومن کو ضرورت ہے کہ وہ انہیں ان کے دائرہ

کے اندر محدود کرے بلکہ بعض وقت تصور کو اس بات کی ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ وہ اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے ان میں سے بعض خواہشات کو ان کے اندرونی دباؤ کے باوجود روک دے۔ مثلاً جنگ میں جب تصور کی ضروریات کی خاطر، بھوک، پیاس یا جنسی خواہشات کو روکنا پڑتا ہے۔ بلکہ خود زندگی کو جس کی بقا کے لئے یہ خواہشات موجود ہیں قربان کرنا پڑتا ہے، صوم اس قسم کے نازک حالات میں تصور کی محبت کو غالب رکھنے کیلئے مومن کی تیاری ہے

اس دنیا میں مومن کی محبت اسی حد تک ترقی کرتی ہے۔ جس حد تک کہ وہ اس ترقی کی استعداد رکھتا ہو اور یہ استعداد اس کی دماغی صلاحیتوں پر موقوف ہے۔ کیونکہ دماغ شعور کا آلہ ہے گویا محبت کی استعداد مختلف انسانوں میں ان کی ذہانت کی نسبت سے مختلف ہوتی ہے، جو شخص ایک ناقص تصور سے دوسروں کی نسبت زیادہ محبت کی استعداد رکھتا ہے۔ وہی تصور کامل سے بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ محبت کر سکتا ہے۔ مومن کے لئے ضروری ہے کہ تصور کامل کے ساتھ اس قدر محبت پیدا کرے جس قدر اس کی فطرتی استعداد اجازت دیتی ہے۔ جب تک وہ ایسا نہیں کرتا اس وقت تک یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی محبت سو فیصدی مخلصانہ نہیں اور اسے محبت میں یک سوئی اور یک بینی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی محبت میں شرکت غیر کا شائبہ ہے اور کوئی باطل تصور ایسا ہے جو ابھی اس کی محبت کی استعداد کو غلط طریق سے مصروف رکھتا ہے۔ لیکن جب مومن اپنی استعداد کے مطابق محبت کے کمال پر پہنچ جائے تو اسے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس نے خدا کو پوری طرح سے جان لیا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ما عرفناک حق معرفتک۔ تو اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی معرفت حق مکمل ہو گئی

خدا کے حسن وجمال کی کوئی انتہا نہیں کہ ہم اس انتہا کو پاسکیں یہی وجہ ہے کہ مومن کی محبت اور معرفت کی ترقی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے جنت میں اہل جنت کی پکار ہوگی، ربنا اتمم لنا نورنا ،لیکن جنت میں مومن کی ترقی کی راہ میں کوئی ایسی رکاوٹیں حائل نہیں ہوں گی۔ جن سے وہ مقابلہ یا جدوجہد کرنے کی ضرورت محسوس کرے اور پھر مقابلہ کے بعد کبھی کامیاب رہے اور کبھی ناکام۔ معرفت کے جس معیار کو وہ دنیا میں حاصل کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے اندر یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی محبت خود بخود ترقی کرتی رہے اور وہ ہر آن حق تعالیٰ کے حسن وجمال کی ایک تازہ جھلک دیکھتا رہے۔ اب نہ تو اُسے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ محبوب کی محبت اس سے باز رہے گی اور نہ کبھی اس بات کا غم لاحق ہوتا ہے کہ اس کی کسی لغزش یا خطا کے باعث وہ درحقیقت باز رہ گئی ہے، لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ انسان کی جو منزل اس کی فطرت کی رُو سے قرار پائی ہے جب تک وہ پہنچ نہ جائے، وہ مجبور ہے کہ ہمیشہ آگے بڑھتا رہے۔ انسان کی منزل مقصود خدا ہے۔ لہٰذا محبت کا ارتقاء موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ والیٰ ربک المنتھیٰ۔

جو لوگ انبیاء کی تعلیم پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ غلط تصورات سے اپنی محبت کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ لہٰذا خواہ وہ زندگی میں کتنی ہی تگ و دو کریں اور اپنے غلط تصور کی کتنی ہی خدمت یا عبادت کریں وہ ذرہ بھر اپنی منزل مقصود کے قریب نہیں آتے۔ بلکہ وہ اپنے غلط عمل کے باعث اس سے پیہم دور ہوتے رہتے ہیں۔ والذین کفروا اعمالھم کرماد اشتدت بہ الریح فی یوم عاصف لایقدرون علیٰ شیئ مما کسبوا

حبطت اعمالہم فلا نقیم لہم یوم القیامۃ وزنا۔ بعض وقت انکی آنکھیں دنیا ہی میں کھل جاتی ہیں اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا معبود صفات حسن و جمال سے عاری ہے اور وہ اپنی گذشتہ زندگی سے انحراف کر کے ایک نئے معبود یا نئے تصور حسن کو اختیار کرتے ہیں اس وقت انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پچھلی جدوجہد سب بے فائدہ تھی لہذا وہ خود اپنے سارے گذشتہ اعمال کو مردود اور بیکار سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں بلکہ نئے تصور کے تقاضوں کے مطابق انکی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر نیا تصور بھی پہلے تصور ہی کی طرح غلط ہو اور وہ اسی پر مر جائیں۔ تو پھر ظاہر ہے کہ اگلی دنیا میں ان کے غلط اعمال اور غلط عبادتیں ان کو اپنی فطرت کی مقرر کی ہوئی منزل کی طرف قدم اٹھانے میں کوئی مدد نہیں دیں گی بلکہ ان کی ترقی کے راستہ میں ایک رکاوٹ بن جائیں گی۔ ایسی صورت میں وہ اپنے اعمال کے ساتھ ایک کشمکش میں مصروف ہوں گے تاکہ ان کے روکنے والے اور مزاحمت کرنے والے اثرات سے نجات پاکر نئے سرے سے اپنی منزل کی راہ اختیار کر سکیں گویا وہ غلط راستہ پر جس قدر آگے جا چکے تھے اسی قدر اس راستہ پر انہیں واپس آنا پڑے گا۔ تب وہ صحیح راستہ پر پہلا قدم رکھ سکیں گے، وہ جہاں سے پھسلے تھے۔ ان کو پھر وہیں پہنچنا ہوگا۔ تاکہ وہاں سے آگے قدم اٹھا سکیں، ظاہر ہے کہ اپنے غلط اعمال کے ساتھ یہ کشمکش اور اپنے غلط راستہ پر قدم بقدم واپسی ایک نہایت ہی اندوہ ناک عمل ہوگا جو محبوب کے ہجر کے احساس کی وجہ سے اور بھی زیادہ حزن و ملال کا موجب ہوگا۔ دوزخ کے عذاب کا ایک پہلو یہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مومن کی جنت کی طرح کافر کی دوزخ کی ابتدا بھی دنیا ہی میں ہوتی ہے۔ مومن دنیا ہی میں اطمینان قلب پا لیتا ہے اور کافر کو دنیا ہی میں خوف و ہراس دامن گیر ہو جاتا ہے۔ جس طرح مومن کی جنت کی

نعمتیں اگلی دنیا میں پہنچ کر کئی گنا بڑھ جاتی ہیں، اسی طرح سے کافر کی دوزخ کی محرومیاں اگلی دنیا میں پہنچ کر کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ دنیا جس طرح سے مومن کے اطمینان قلب کو مکمل نہیں ہونے دیتی، اسی طرح سے کافر کے خوف و ہراس کو بھی مکمل ہونے نہیں دیتی۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا ہے۔

الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر۔

اس دور میں تجزیہ نفس کے ماہرین (PSYCHOS-ANALYSTS) نے فطرت انسانی کے متعلق جو تحقیقات کی ہے اس کی رو سے یہ امر قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ بچپن سے لے کر مرتے دم تک ہر کام جو انسان کرتا ہے خواہ اس کی نظروں میں وہ کتنا ہی غیر اہم اور ناقابل اعتناء ہو۔ انسان کے لاشعور (UNCONSCIOUS) میں کا نقش فی الحجر محفوظ رہتا ہے۔ وقت کے گذرنے سے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور وقت اور فاصلہ کے قوانین بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شعوری طور پر انسان ان واقعات کو فراموش کر دیتا ہے لیکن لاشعور انہیں ہمیشہ اور جوں کا توں یاد رکھتا ہے۔ انسان کا لاشعور گویا اس کے سارے افعال و اعمال کا ایک ناقابل محو ریکارڈ ہے، ہم جب چاہیں معمول پر ہپناٹک نیند طاری کر کے اس ریکارڈ کے کسی حصہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس ریکارڈ کی موجودگی کا ایک اور بین ثبوت یہ بھی ہے کہ اس سے ہمارے روزمرہ کے خوابوں کا تاروپود تیار ہوتا ہے۔ انسان کا لاشعور گویا اس کا اعمالنامہ ہے جو اس کی گردن میں ڈال دیا گیا ہے اور ہر روز لکھا جاتا ہے اس سے انسان کا چھٹکارا نہیں۔ یہی اس کی قسمت کی نحوست اور سعادت کو معین کرتا ہے۔ وکل انسان الزمنٰہ طائرہٗ فی عنقہ۔ انسان کے لاشعور کا یہ خاصہ قرآن کے

ارشادات کی تصدیق کرتا ہے۔ ان علیکم لحافظین کراماً کاتبین ۵ یعلمون ما تفعلون ۵
(ترجمہ) بلاشبہ تم پر دیکھ بھال کرنیوالے مقرر کیئے گئے ہیں معزز لکھنے والے جو تمہارے کاموں کو جانتے ہیں۔ موت کے بعد انسان کا یہ اعمالنامہ اس کے سامنے آجائے گا تاکہ وہ اس کی جزا اور سزا خود پالے۔ اور وہ اُسے پڑھ پڑھ کر حیران ہوگا کہ اس کی زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا عمل، اچھا یا بُرا ایسا نہیں جو اس میں درج ہونے سے رہ گیا ہو۔ ما لهٰذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها ــ و
من یعمل مثقال ذرة خیرا یره ومن یعمل مثقال ذرة شرا یره ۵

اس بات کے باوجود کہ انسان کے دماغ اور سارے جسم کے مادی ذرات اور سالمات پے در پے بدلتے رہتے ہیں انسان کے لاشعوری اعمالنامہ کا غیر متغیر حالت میں موجود رہنا اور پھر وقت اور فاصلہ کے ان قوانین کی زد سے باہر ہونا جو اس مادی دنیا میں نافذ ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا شعور جو اصل انسان ہے ایک ایسی چیز ہے جو جسم کے تغیرات حتیٰ کہ جسم کی فنا سے بالاتر ہے اور اگلی دنیا میں جہاں وقت اور فاصلہ کے قوانین رائج نہیں زندہ رہ سکتا ہے، انسان کے اعمال کا ریکارڈ اس کے شعور ہی کا حصہ ہے یہ ریکارڈ اور جو چیز اس کو محفوظ کرتی ہے، خود انسان ہی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لہٰذا اگر یہ ریکارڈ مادی حالات سے بے نیاز ہو کر محفوظ رہ سکتا ہے۔ تو انسان بھی مادی دنیا کے بغیر محفوظ رہ سکتا ہے اس ریکارڈ کا محفوظ رہنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت کے نزدیک اس کا کوئی مصرف اور مدعا ہے جو اگلی دنیا میں تکمیل پائے گا۔ انسان کی فطرت کا یہ تقاضہ کہ اسے ہر حالت میں اپنی روحانی ترقی کی انتہا تک پہنچنا چاہیئے اس مدعا پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ باور کرنے کے لئے ایک معقول وجہ مہیا کرتا ہے

کہ موت کے بعد جن لوگوں کے اعمال اچھے ہوں گے، یعنی ان کی منزل مقصود کی طرف راہ نمائی کرنے والے ہوں گے وہ تو آسانی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں گے اور جنت میں ہوں گے اور جن لوگوں کے اعمال بُرے ہوں گے یعنی انہیں اپنی فطرت کی مقرر کی ہوئی منزل مقصود سے ہٹانے والے ہوں گے وہ ان کے اثرات سے پاک ہونے کے لئے ایک خوفناک جدوجہد میں مصروف رہیں گے اور دوزخ میں ہوں گے، ہر شخص اپنی دوزخ اور جنت اس دنیا میں بناتا ہے اور اگلی دنیا میں اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں یہ بتانے کی گنجائش نہیں کہ کس طرح جنت کی حوریں اور نہریں اور دوزخ کی آگ اور زقوم اور ماء حمیم محض استعارات نہیں بلکہ اسی طرح کی سچ مچ کی چیزیں ہوں گی جیسی کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں۔

چونکہ عمل محبت کی ترقی کا ایک ذریعہ ہے۔ مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عمل کے میدان کو تنگ نہ ہونے دے بلکہ اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اُسے پوری وسعت دے، فطرت انسانی کی ضروریات کے مطابق عمل کے میدان کی توسیع اور تقویم خود ایک عمل ہے جو محبت کو ترقی دیتا ہے۔ انسان کا میدان عمل صفات ربانی کی جلوہ گاہ ہے اسے محدود کرنا ظہور صفات کو محدود کرنا ہے۔ رہبانیت عمل کے میدان کو محدود کرتی ہے اس لئے محبت کی ترقی اور پختگی کے لئے مضر ہے۔ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کی محبت کمال پر پہنچے، ظاہر ہے کہ یہ تقاضا انسان کی فطرت کے کسی حصہ کو دبانے، یا روکنے سے پورا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے مکمل اظہار سے پورا ہوگا۔ جب درخت اُگتا ہے اور نشوونما پاتا ہے تو اس کی ہر شاخ بڑھتی اور

پھولتی ہے اور اگر یہ بات نہیں تو ہم کہیں گے کہ درخت کی نشوونما خاطر خواہ طریق سے نہیں ہو رہی۔ انبیاء کی دعوت کا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ انسان کی فطرت کے تقاضوں میں سے کسی ایک کو بھی روکا جائے بلکہ اس کے بالکل برعکس اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اپنی فطرت کے سارے تقاضوں کو بہ تمام و کمال پورا کرنے میں مدد دی جائے۔ کیونکہ انسان کی فطرت کا ہر تقاضہ اس کے سب سے بڑے تقاضہ یعنی تکمیل محبت کا موئید اور معاون ہے یعنی حق تعالیٰ کی محبت کی ایک شاخ ہے۔ اگر محبت کی ہر شاخ نشوونما پا رہی ہے تو محبت کا درخت بھی نشوونما پا رہا ہے ورنہ نہیں۔ بلکہ انبیاء کی تعلیم کی ساری اہمیت یہ ہے کہ اس کے بغیر انسان اپنے فطرت کے سارے تقاضوں کو تمام و کمال پورا نہیں کر سکتا، اور لہٰذا اپنی زندگی میں ناھوش اور پریشان اور اطمینانِ قلب کی گراں قدر نعمت سے محروم رہتا ہے۔

انسان کی فطرت کا ایک اہم تقاضہ یہ ہے کہ وہ شادی کرتا ہے اور ایک خاندان میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے، مختلف رشتہ داروں سے اپنے تعلقات کی وجہ سے وہ کئی حیثیتیں اختیار کرتا ہے، مثلاً وہ بیٹا، بھائی باپ، خاوند، داماد یا سسر ہوتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس، مومن کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ہر حیثیت میں دوسروں سے ایسا برتاؤ کرے جو صفاتِ جمال کے مطابق ہو ورنہ اس کی محبت نشوونما نہیں پائے گی۔ دوسروں کے ساتھ تعلقات میں صفاتِ جمال کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسروں کی جسمانی اور روحانی تربیت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے۔ بلکہ حتی المقدور اس تربیت کی تائید اور اعانت کی جائے کیونکہ یہ تربیت خدا نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ اپنی صفاتِ جمال کا اظہار کرتا ہے۔ خاندانی تعلقات کی بنیاد

انسان کی حیوانی جبلتوں پر جو خدا کی محبت رحمت اور ربوبیت کا مظہر ہیں تصور کامل کی ضروریات کے ماتحت ان جبلتوں کی اعانت کرنا، اظہار جمال کی ایک مشق ہے، ناقص تصورات جو انسان کی حرص وہوا اور ظلم و تعدی سے سہارا لیتے ہیں۔ ان جبلتوں کی صحیح تسکین و تشفی کے راستہ میں ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ صرف مرد مومن ہی ایک ایسا انسان ہے جو ان جبلتوں کی مناسب تائید اور اعانت کر سکتا ہے اور خاندانی تعلقات کو ٹھیک طریقہ سے یعنی صفات جمال کے تقاضوں کے مطابق نبھا سکتا ہے۔ جب وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے دل میں حق تعالےٰ کی محبت یا معرفت اور بھی ترقی کرتی ہے۔

انسان کی فطرت کا ایک اور اہم تقاضہ جو مومن کے لئے ایک بہت بڑا میدانِ عمل مہیا کرتا ہے، یہ ہے کہ ایک تصور کو ماننے والے افراد اپنے تصور کی محبت کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں اور مل کر ایک جماعت بن جاتے ہیں، پھر اس جماعت میں ایک تنظیم پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک ریاست کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جماعت کے افراد جس قدر زیادہ اپنے تصور سے محبت رکھتے ہیں۔ اسی قدر زیادہ ایک دوسرے سے بھی محبت رکھتے ہیں یہ دونوں قسم کی محبتیں ایک دوسرے کے موید اور معاون ہوتی ہیں۔ لہذا جوں جوں یہ دونوں محبتیں ترقی کرتی ہیں۔ جماعت کی تنظیم، وحدت، اخلاقی قوت اور اس کے افراد میں اخوت اور ہمدردی کا جذبہ اور مساوات کا احساس ترقی کرتا ہے۔ یوں تو ہر تصور کے ماننے والے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں۔ لیکن صحیح اور کامل تصور کو ماننے والی جماعت کی صورت میں افراد جماعت کی باہمی محبت ترقی کر کے اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے کیونکہ تصور کامل کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کی محبت انسان کی سفلی خواہشات پر پورا

پورا غلبہ پالیتی ہے، یہاں تک کہ پھر یہ سفلی خواہشات نصور کی محبت میں رکاوٹ پیدا نہیں کرسکتیں اور تصور کی محبت ترقی کا راستہ کھلا پاکر کمال کو پہنچ جاتی ہے لہٰذا پرستاران حق کی جماعت کی وحدت، تنظیم اور اخلاقی قوت اور اس کے افراد کے جذبات محبت، اخوت، ہمدردی اور مساوات بھی درجۂ کمال پر ہوتے ہیں اس جماعت کی وحدت یہاں تک ترقی کرجاتی ہے کہ وہ جسد واحد کی طرح ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ ایک کا دکھ سب کا دکھ ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، المومنون کجسد واحد اذا اشتکی بعضہ اشتکی کلہٗ المسلمون کرجل واحد اذا اشتکی عینہ اور اسہ اشتکی کلہٗ، ماہرین علم الحیات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک جسم حیوانی بہت سے افراد کی مکمل تنظیم اور مکمل وحدت کا نام ہے۔ یہ افراد خلیات (CELLS) ہیں ہر خلیہ ایک خود مختار جسم حیوانی ہے جو اپنی بقاء کے لئے خوراک حاصل کرتی، زندہ رہتی، طاقت ور ہوتی یا خوراک حاصل نہ کرسکنے کی صورت میں کمزور ہوتی اور مرتی ہے۔ جسم کے تمام خلیات سارے جسم کی ضروریات کے مطابق علیحدہ علیحدہ فرائض انجام دیتی ہیں۔ لیکن سب کی سب ایک ہی مرکزی نظام کے ماتحت ہیں۔ جسے ہم دماغ یا نظام عصبی کہتے ہیں۔

ان دنوں ہمیں فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں دقت پیش آرہی ہے، لیکن اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں جسد واحد کی مثال پر غور کریں تو یہ دقت رفع ہو جاتی ہے، جسد واحد کے اندر زندگی کی رو جو دماغ اور نظام عصبی کے ذریعہ سے تقسیم ہوتی ہے۔ ہر خلیہ کی پرورش کرتی اور اُسے تقویت دیتی ہے۔ زندگی کی اسی رو پر جسم کی صحت تندرستی اور طاقت کا انحصار ہے۔ جب خلیہ طاقت ور ہو جاتی ہے تو اپنی فالتو طاقت

طاقت کو جسم کی مرکزی قوت کے ذریعہ سے باقی خلیات کے حوالے کردیتی ہے۔ یہ گویا خلیہ کی زکوٰۃ ہے۔ اس سے دوسرے خلیات، یعنی سارا جسم طاقت حاصل کرتا ہے پھر جسم کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے ہر خلیہ اور طاقتور ہوجاتی ہے گویا ہر خلیہ جسم سے طاقت لیتی بھی ہے اور جسم کو طاقت دیتی بھی ہے اور جسم خلیہ سے طاقت حاصل بھی کرتا ہے۔ اور اسے عطا بھی کرتا ہے، بالکل یہی حال فرد اور جماعت کا ہے۔ جماعت کے اندر زندگی کی رو، جو اسے متحد اور منظم کرتی ہے اور اُسے فرد واحد کی شکل دیتی ہے اس کے تصور حیات کی محبت ہے، جس جماعت کی محبت تصور کمال پر ہوگی وہ پوری طرح سے طاقتور، تندرست اور زندہ ہوگی۔ جماعت کی تنظیم کا نام حکومت ہے، حکومت ایک جماعتی جسد میں دماغ یا نظام عصبی کی قائمقام ہے۔ جس طرح سے دماغ کے ذریعہ سے جسم حیوانی کے اعضاء میں زندگی کی رو تقسیم ہوتی ہے، اسی طرح سے حکومت کے ذریعہ سے افراد کی محبت کی نشوونما یعنی ان کی روحانی تعلیم اور تربیت کا انتظام ہوتا ہے۔ جب جماعت یا حکومت کی اعانت سے فرد کی روحانیت قوت حاصل کرتی ہے یا اس کی محبت ترقی کرتی ہے۔ تو فرد اس ترقی یافتہ روحانیت یا محبت سے ساری جماعت کو حصہ دیتا ہے یہ تقسیم قوت فرد کی زکوٰۃ ہے اور حکومت یا جماعت اس تقسیم قوت کا آلۂ کار بنتی ہے، پھر جماعت اپنی ترقی یافتہ قوت کی وجہ سے اور بھی زیادہ اس قابل ہوجاتی ہے کہ فرد کی روحانی تربیت کا کام موثر طریق سے انجام دے سکے۔

اگر پوچھا جائے کہ فرد جماعت کے لئے ہے یا جماعت فرد کے لئے تو بلاتردد اس کا جواب یہ ہوگا کہ جماعت فرد کے لئے ہے لیکن اس کا کیا

علاج کہ جب تک فرد اپنے آپ کو جماعت میں نہ کھوئے۔ اس وقت تک وہ ایک فرد کی حیثیت سے اپنے کمالات کو نہیں پا سکتا۔ فرد کی فطرت کے ممکنات کے ظہور کے لئے ضروری ہے کہ فرد جماعت میں زندگی بسر کرے اور اپنے آپ کو جماعت میں مدغم کر دے۔ جس حد تک وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے جماعت کے مفاد کی مخالفت کرے گا۔ اسی حد تک اس کی اپنی انفرادیت ناقص رہے گی اور وہ ایک فرد کی حیثیت سے ناپختہ اور ناتمام رہے گا۔ یعنی اس کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت اپنے کمال کو نہیں پہنچے گی، یہی سبب ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں جماعتی احساس کو طاقت ور کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، علیکم بالجماعۃ من شذّ شذّ فی النار، مومن اپنے دوسرے بھائیوں سے مل کر اور ایک مرکز، اور ایک قائد کے ماتحت ایک نظام اور وحدت میں داخل ہو کر نماز ادا کرتا ہے۔ جب اس کا قائد کھڑا ہوتا ہے تو وہ کھڑا ہوتا ہے جب وہ رکوع کرتا ہے تو وہ بھی رکوع کرتا ہے۔ جب وہ سجدہ میں گرتا ہے تو وہ بھی سجدہ میں گرتا ہے اس نماز باجماعت سے غرض یہ ہے کہ مومن کو معلوم رہے کہ وہ ایک نہیں بلکہ ایک جماعت ہے اور یہ کہ اس کی جماعت کا مقصد بھی ایک ہے اور وہ مقصد بھی وہی ہے جو نماز کا مقصد ہے یعنی طلب جمال یا تکمیل محبت اور اس کے سوا اور کوئی نہیں، مومن کی نماز باجماعت چھوٹے پیمانہ پر اس کی ساری زندگی کا ایک نقشہ ہے۔ اس کی ساری زندگی ایک قائد یا راہ نما کے ماتحت گویا ایک نماز باجماعت ہے اسی لئے نماز باجماعت کی ہدایت خود قرآن میں ہے، وارکعو مع الراکعین، چونکہ مومن اپنے آپ کو ایک جماعت سمجھتا ہے اس

لئے وہ اپنی دعاؤں میں بھی جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃً و فی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار، نماز باجماعت، حج، زکوٰۃ اور روزہ مومن کی جماعتی زندگی کے قیام اور اس کی اخوت کی پرورش کے ذرائع ہیں، جماعت میں کھو جانے سے فرد اپنے آپ کو پاتا ہے اور اس کی محبت ترقی کرتی ہے۔ اس کی ترقی یافتہ محبت کی وجہ سے جماعت اور بھی زیادہ منظم اور متحد ہو جاتی ہے۔

ان حقائق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ، بہت سی مختلف خلیات کو ایک ہی نظام عصبی کے ماتحت متحد اور منظم کر کے ایک جسد واحد بنا دیتا ہے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ تمام نوع بشر کے افراد کی باہمی محبت اور اخوت یہاں تک ترقی کرے کہ وہ سب ایک ہی حکومت کے ماتحت متحد اور منظم ہو کر ایک جسد واحد بن جائیں۔ اس نے سب انسانوں کیلئے ایک ہی فطرتی نظریۂ زندگی مقرر کیا ہے تاکہ اختلافات کی بنیاد ہی باقی نہ رہے۔ نوع بشر کے باہمی اختلافات کی وجہ نظریات زندگی کی رنگا رنگی ہے۔ خداوند تعالیٰ چاہتا ہے کہ نظریہ توحید کی بنیاد پر ایک ایسی ریاست وجود میں آئے جو فرد واحد کی طرح متحد و منظم ہو اور جد وجہد کر کے تمام دنیا پر پھیل جائے اور پھر ساری نوع انسانی کو اس طرح سے متحد و منظم کرے کہ وہ ایک فرد واحد کی طرح ہو جائیں۔ انسان کی غیر مبدل فطرت کے تقاضے نہ صرف خدا کے اس منشاء کا پتہ دے رہے ہیں۔ بلکہ اس بات کی ضمانت ہیں کہ یہ منشاء پورا ہو کر رہے گا۔ ہر بیج سے وہی درخت اُگتا ہے جو اس کی فطرت میں موجود ہو۔ پھر قرآن کی اس پیشگوئی سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ

علی الدین کلہ ولو کرہ الکفرون،

جماعت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے فرد کو کس حد تک اپنے مفاد کی قربانی کرنی چاہیئے۔ اس کا اندازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ہو سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ امرا تمہیں نماز پڑھاتے ہیں اگر انہوں نے نماز، غلط طریق سے پڑھائی تو اس کا بوجھ ان کی گردن پر ہوگا، لیکن تمہیں ہر حالت میں ان کی اطاعت کرنی چاہیئے گویا اطاعت میں رہ کر اور جماعت کی وحدت اور تنظیم کو برقرار رکھتے ہوئے اگر فرد نماز جیسے ایک مقدس فرض کی ادائیگی میں غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو جائز ہے لیکن اگر اپنے آپ کو اور دوسروں کو درست کرنے کی خاطر، جماعت میں افتراق پیدا کرتا ہے تو خطاکار ہے اور اس قابل ہے کہ آگ میں جھونکا جائے۔ کیونکہ اس طرح سے اس نے خدا کی عبادت ہی سے انحراف کیا ہے۔ فرد کے لئے ضروری ہے کہ اپنی محبت کی حفاظت اور تربیت کی خاطر جماعت کو برقرار رکھے۔ اگر جماعت نہیں تو وہ بھی نہیں۔ جب ایک فرد واحد غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے اعضاء و جوارح اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح سے فرد کی وحدت قائم رہتی ہے اور فرد اس قابل ہوتا ہے کہ جب اپنی غلطی کا احساس کرے تو اس سے واپس آئے اور اس کی تلافی کرے۔ لیکن اگر اس کے اعضاء و جوارح اس سے کٹ کر الگ ہو جائیں کہ ہم غلطی پر تعاون نہیں کریں گے تو فرد کی وحدت اور لہذا اس کی ترقی ختم ہو جائے گی، نہ صرف یہ کہ پھر وہ اس غلطی کی تلافی نہیں کر سکے گا۔ بلکہ آئندہ کے لئے اپنے مدعا کے حصول کے لئے کوئی کامیاب جدوجہد نہیں کر سکے گا۔ ہماری صحیح فطرت یہ ہے کہ ہم جماعت میں رہیں۔ جس طرح سے فرد کبھی غلطی پر ہوتا ہے اور کبھی راستی پر، لیکن مجموعی طور

پر اپنے تصور کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح سے جماعت کبھی غلطی پر ہوتی ہے اور کبھی راستی پر۔ لیکن مجموعی طور پر اپنے تصور کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔
اوپر میں نے عرض کیا ہے کہ فرد اور جماعت یا ریاست دونوں کا مقصد فرد کی روحانی تربیت ہے اور میں نے فرد کی جسمانی تربیت کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن روحانی تربیت میں جسمانی تربیت بھی شامل ہے۔ جسم کی تربیت کے بغیر، محبت کی تربیت ممکن نہیں۔ اس زمانہ میں جب اشتراکیت کے پراپاغنڈہ نے روٹی کے مسئلہ کو حد سے زیادہ اہمیت دے دی۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مومن کے نزدیک جسم کی تربیت بذات خود کوئی اہمیت یا حیثیت نہیں رکھتی اور فقط محبت کی تربیت کا ذریعہ ہے کیونکہ جسم کے قیام اور بقاء کے بغیر فرد اور جماعت دونوں کے لئے ممکن نہیں کہ محبت کی ترقی کے لئے عمل کے میدان میں جدوجہد کر سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کاد الفقر ان یکون کفراً۔
ایک منظم جماعت یا ریاست کے افراد کی باہمی محبت جو جماعت یا ریاست کے قیام بقا اور ارتقا کا ذریعہ بنتی ہے۔ انسان کی فطرت کے تین عناصر سے قوت حاصل کرتی ہے۔ اول جماعت میں رہنے کی وہ جبلتی خواہش جسے ہرڈ انسٹنگ (HERD INSTINCT) کا نام دیا گیا ہے اور جو حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے اس جبلتی خواہش کی وجہ سے انسان مجبور ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے، دوئم تصور کی محبت جس کی وجہ سے ایک انسان تمام ایسے انسانوں سے کشش میل جول اور اتحاد کی خواہش رکھتا ہے جو اس کے اپنے تصور کو مانتے ہوں۔ سوئم انسان کی محبت انسان کے لئے جس کی وجہ سے ایک انسان تمام دوسرے انسانوں سے

خواہ وہ کسی تصور کے ماننے والے ہوں اور کسی مذہب ملت قوم وطن یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں ایک فطرتی کشش رکھتا ہے یہ آخری قسم کی محبت جبلتی سطح کی خواہش نہیں بلکہ انسانی اور نفسیاتی سطح کی خواہش ہے اور جستجوئے جمال کے فطرتی جذبہ کا ایک حصہ ہے۔ صرف ایک مرد مومن ہی ہے۔ جس کا تصور ان تینوں قسم کی خواہشات کو پوری طرح سے اظہار پانے کا موقعہ دیتا ہے۔ جہاں تک پہلی جبلتی خواہش کا تعلق ہے، مومن جبلت کو خدا کی رحمت اور ربوبیت کا نشان سمجھ کر بحد جواز اس کی اعانت کرتا ہے اور دوسری خواہش کے سلسلہ میں یہ پہلے بتایا گیا ہے کہ کیونکہ صرف مرد مومن کی محبت تصور ہی ایسی ہے جو کمال کو پہنچ سکتی ہے۔ تیسری خواہش چونکہ خدا کی محبت کا ایک حصہ ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ اس کی پوری تشفی مرد مومن ہی سے ہو سکے گی۔ مومن جس طرح دوسرے انسانوں سے محبت کر سکتا ہے، کافر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مومن جانتا ہے کہ تمام انسان اس کے محبوب اور معبود کے پیدا کئے ہوئے بندے ہیں اور ان کا پیدا کرنے والا ان سے محبت رکھتا ہے۔ اسی محبت کی وجہ سے اس نے ان کی ہدایت اور روحانی تربیت کا یہ انتظام کیا ہے کہ انبیاء کو بھیجا ہے اور پھر خود اس کو بھی ان کی ہدایت اور تربیت کے لئے مامور کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ اللھم اشھد انک انت اللہ لا الہ الا انت ان العباد کلھم اخوۃ، خدا کے بندوں سے محبت کرنا خود خدا سے محبت کرنا ہے۔

تاہم گو مومن کافر سے بحیثیت ایک انسان کے محبت کرتا ہے لیکن کافر کے تصورات سے محبت نہیں کرتا بلکہ ان سے انتہائی نفرت کرتا ہے۔ یہاں

تک کہ ان کو مٹادینا چاہتا ہے۔اس کی یہ نفرت درحقیقت خدا اور انسان کی محبت ہی کا ایک پہلو ہے مومن جس قدر حق سے زیادہ محبت رکھتا ہے اسی قدر باطل سے زیادہ نفرت کرتا ہے۔ اس کی یہ نفرت اس کی صفاتِ جلال یعنی اس کے قہر اور غصہ اور حمیت اور غیرت کی آئینہ دار ہے اور اسی کی وجہ سے مومن غلط تصورات کو مٹا کر نوع بشر کو کامل اور صحیح تصور کی محبت سے مالا مال کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو اس نفرت کی وجہ سے وہ کافر کے ساتھ جنگ کرنے پر بھی آمادہ ہوجاتا ہے تاکہ حق کے راستہ سے غلط تصورات کی رکاوٹ اور مزاحمت کو ہٹا دے۔ اس طرح سے اس کی نفرت انسانیت کے لئے خدا کی محبت رحمت اور ربوبیت کا مظہر بنتی ہے۔ محمد الرسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانا، — اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکفرین یجاھدون فی سبیل اللہ لا یخافون لومۃ لائم، مومن کافر سے اسی حد تک اخوت محبت میل ملاقات اور تعاون کا اظہار کرتا ہے، جس حد تک کہ اس کا تعاون کافر کے باطل تصور کے محارب اور جلالی پہلو کے لئے باعث تقویت نہ بنے

لا یتخذ المومنون الکفرین اولیاء من دون المومنین۔

تصورات حیات کی باہمی کشمکش اور جنگ وجدال جو کبھی خوں ریز ہوتی ہے اور کبھی پُر امن لیکن جو ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ آخر کار ایک ہی تصور حیات تمام تصورات پر غالب آئے گا اور دنیا پر چھا جائے گا۔ یہی وہ تصور ہوگا، جو دنیا میں دائمی امن وامان قائم کرے گا اور جس کی وجہ سے جنگوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ یقیناً یہ تصور

توحید ہی کا تصور ہو سکتا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے پائیدار اور مستحکم ہے، غلط نظریاتِ زندگی میں سے اگر کوئی نظریہ کسی وقت دنیا پر چھا بھی جائے تو اس کا غلبہ عارضی ہوگا، اس کی مزاحمت خود اس کے ماننے والوں کی فطرت کے اندر سے پیدا ہوگی یہاں تک کہ وہ خود اس کو موت کی نیند سلا دیں گے۔ تصورات کی باہمی کشمکش میں پرستارانِ حق کو بھی شریک ہونا پڑے گا۔ کیونکہ باطل کی دعوتِ مبارزت پر لبیک کہنا مومن کی صفاتِ جلال کا تقاضہ ہے اور وہ اس تقاضے کو پورا کریں گے۔ ان کا جہادِ حق کی آخری کامیابی کا ذریعہ ہوگا۔ بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق ـــــ حق علینا نصر المومنین پرستارانِ حق کے تصور کی نوعیت ہی ان کی آخری کامیابی کی ضمانت ہے اس تصور کا ظہور باطل کے لئے موت کا پیغام ہے، قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً۔

عقیدہ توحید کی اس تشریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے دو پہلو ہیں ایک عقائد اور دوسرا اعمال، ایک نظریۂ زندگی اور دوسرا اس نظریہ کے مطابق عمل، ہر عقیدہ عمل میں منتقل ہوتا ہے اور ہر عمل سے پہلے ایک عقیدہ موجود ہوتا ہے۔ ہر عمل کی نوعیت اس کے پیش رو عقیدہ کی نوعیت پر موقوف ہوتی ہے۔ غلط عقائد سے غلط اعمال پیدا ہوتے ہیں اور صحیح عقائد سے صحیح اعمال اگر ہم چاہیں کہ کسی قوم کا عمل اچھا ہو جائے تو ہمیں صرف اس کا عقیدہ درست کرنے کی ضرورت ہے، پھر عمل خود بخود پیدا ہوگا۔ لہذا جو چیز اسلام کی روح مغز یا اصل یا بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اسلام کے عقائد ہی ہیں، عقائد ہی کو قرآن مجید نے امّ الکتاب یعنی قرآن کی ماں کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ پھر اسلامی عقائد فطرت انسانی کے لازوال قوانین پر مشتمل ہیں اس لئے عقائد

کو آیتٌ محکمٰتٌ بھی کہا گیا ہے، یعنی پختہ نشانات صفات، ھوالذی انزل علیك الکتاب منہ ایت محکمٰت ھن ام الکتاب ، پھر چونکہ یہ عقائد پختہ اور محکم قوانین فطرت ہیں ان کے مطابق عمل کرنے کو دین قیم کہا گیا ہے، اقم وجھك للدین حنیفاً فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذالك الدین القیم، ظاہر ہے کہ انسان کائنات کا ایک اہم ترین جزو ہے۔ لہذا فطرت انسانی کے قوانین ساری کائنات کے قوانین سے الگ نہیں ہو سکتے، فطرت انسانی کا نظریہ ساری کائنات کا نظریہ ہے کائنات میں بھی وہی صفات جمال ظہور پذیر ہوتی ہیں، جن کی محبت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ فطرت انسانی سرّ کائنات ہے، قل انزلہ الذی یعلم السرّ فی السمٰوٰت والارض۔

فطرت انسانی اور فطرت کائنات کے نظریہ یعنی اسلامی عقائد یا اسلامی نظریۂ حیات کے اہم ترین نقاط، جو قدرت کے غیر مبدل قوانین پر مشتمل ہیں۔ حسب ذیل ہیں:-

(۱) انسان اور کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئے بلکہ ان کا ایک خالق ہے (۲) وہ، خالق، حي و قیوم ہے، رحمان اور رب اور رحیم اور کریم ہے، سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے، شکور و ودود، قہار اور جبار ہے۔ غرضیکہ تمام صفات جمال و جلال کا مالک ہے (۳) خالق کائنات نے انسان کے دل میں اپنی اور اپنی صفات جمال کی محبت کا ایک نہایت ہی شدید اور طاقتور جذبہ رکھ دیا ہے جو اپنا اظہار چاہتا ہے (۴) جب تک انسان اس فطرتی جذبہ کا صحیح اور کامل اظہار نہ کرے وہ بے اطمینان اور بے قرار رہتا ہے (۵) محبت کا یہ جذبہ ایسا نہیں کہ اسے روکا جا سکے۔ لہذا جب انسان اس جذبہ کے صحیح اور کامل اظہار

کا طریقہ نہ جانتا ہو تو وہ مجبوراً غلط طریق سے اس کا اظہار کرتا ہے یعنی کسی ایسے
معبود کو اپنا لیتا ہے جو صفات جمال تو نہیں رکھتا لیکن جس کی طرف وہ ناحق
طور پر صفات جمال منسوب کر دیتا ہے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی خواہش
اسے غلطی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ (۶) انسان موت سے فنا نہیں ہوتا بلکہ اس
زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جہاں انسان اپنی محبت کے اس حصہ
کی تکمیل کرتا ہے جو اس دنیا میں تکمیل پانے سے رہ گیا ہو۔ (۷) غلط معبود کی
پرستش اور عبادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کی ساری سرگرمیاں
غلط راستہ اختیار کرتی ہیں اور اس کی فطرتی محبت کی تکمیل کے لئے فائدہ
نہیں دیتیں۔ موت کے بعد اسے اپنے غلط عمل کے اس سارے راستہ پر
واپس آنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی غلط محبت سے نجات پاکر صحیح محبت کی ابتدا
کرے اور اسے انتہا تک پہنچائے اس غرض کے لئے اسے دوزخ کی سختیوں
کو جھیلنا پڑتا ہے جہاں وہ اپنے غلط اعمال کی سزا بھگت کر پاک ہوتا ہے (۸)
چونکہ غلط معبود بہت سے ہو سکتے ہیں اس لئے جو لوگ اپنے فطرتی جذبہ محبت
کی صحیح راہ نمائی نہیں پاتے۔ وہ مختلف معبودوں کے ماتحت مختلف گروہوں
میں بٹ جاتے ہیں ان کی وجہ سے نوع انسانی میں افتراق پیدا ہوتا ہے۔ اور
دنیا میں جنگ و جدال کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ ان الذین تفرقوا دینھم
وکانوا شیعًا لست منھم فی شیئٍ۔ (۹) چونکہ انسان کے فطرتی جذبہ محبت
کا بہکنا اس کے لئے حد درجہ خطرناک تھا۔ لہٰذا قدرت نے جس طرح انسان
کی اور ضرورت کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا ہے اسی طرح اس کے اس جذبہ
کی راہ نمائی بھی اپنے ذمہ لی ہے اور اس غرض کے لئے اپنا انتظام کیا ہے۔
جسے نبوت کہتے ہیں (۱۰) انسان کے فطرتی جذبہ محبت کے صحیح اور مکمل

اظہار کی ابتدا، اس وقت ہوتی ہے جب وہ خدا اور اس کی صفات جمال پر ایمان لاتا ہے ایمان لانے سے اس کے دل میں جمال حقیقی کا فطرتی احساس بیدار ہوتا ہے (۱۱) احساس حسن یا ایمان عمل یا عبادت میں اپنا اظہار چاہتا ہے (۱۲) عبادت، یا عمل کے دو پہلو ہیں ایک مطالعہ جمال اور دوسرا اظہار جمال دونوں مل کر مومن کی محبت کو کمال پر پہنچاتے ہیں (۱۳) مطالعہ جمال صفات حسن پر غور و فکر کرنے کا نام ہے اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان مظاہر قدرت پر غور و فکر کر کے ان میں صفات جمال کا مشاہدہ کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ نہایت اخلاص کے ساتھ اور دل کی پوری توجہ سے اسماء حسنیٰ کا ذکر کرے اور باقاعدگی کے ساتھ خدا کی حمد و ستائش اور تسبیح و تقدس کو اپنا شعار بنائے مطالعہ جمال کے یہ دونوں طریقے محبت کی ترقی اور تکمیل کے لئے ضروری ہیں (۱۴) اظہار جمال اپنے آپ کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرتے ہوئے یعنی اپنی اخلاقی زندگی میں صفات جمال کو ملحوظ رکھنے کا نام ہے (۱۵) انسان کی اخلاقی زندگی کے مختلف شعبے ہیں (الف) اپنے آپ کیساتھ برتاؤ (ب) خویش و اقربا کیساتھ برتاؤ (ج) اپنی جماعت کے ساتھ برتاؤ (د) اپنی جماعت سے باہر غیر لوگوں سے برتاؤ، جب مومن اپنی ذات اور خلقت کے ساتھ اپنے برتاؤ میں صفات جمال کا اظہار کرتا ہے تو اس کی محبت ترقی کرتی ہے سیاسی آزادی کا حصول اور قیام تبلیغ دین، نماز باجماعت، روزہ، زکوٰۃ اور جہاد عمل کے وہ طریقے ہیں جو فرد کو مدد دیتے ہیں کہ وہ ان تعلقات کو صفات ربانی کے تقاضوں کیمطابق نبھائے، ان میں سے ہر چیز عبادت بھی ہے اور عبادت کی مشق اور تیاری بھی ہے (۱۶) سیاسی آزادی کے بغیر عمل کی آزادی، اور لہذا محبت کی پوری پوری نشو و نما ممکن نہیں (۱۷) نبوت کی ہدایت کو قبول کرنے سے انسان اس دنیا میں اطمینان، امن، اتحاد اور صلح کی زندگی پا سکتا ہے اور پھر چونکہ ہدایت نبوت قبول کرنے سے اس دنیا میں اس کی محبت اس کی استعداد کے مطابق درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے لہذا اگلی دنیا میں بھی اسما

کی ترقی بلا خوف و خطر جاری رہتی ہے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے فطرت انسانی کے اس نظریہ کی تعلیم دی ہے لیکن ان میں سے کسی پیغمبر کو ایسے حالات پیش نہیں آئے کہ ان کی اصلاح کرتے ہوئے وہ فطرت انسانی کے تمام ضروری پہلوؤں کو بے نقاب کر سکتا۔ ہر پیغمبر کے زمانہ کا اقتضا ایسا ہی تھا۔ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کی خاص تمدنی اور اخلاقی حالت کے پیش نظر اپنی تعلیم میں فطرتِ انسانی کے خاص خاص پہلوؤں پر زور دیا اور بعض خاص پہلوؤں کو جن کی تعلیم کی ضرورت اس کی قوم کو نہیں تھی یا جن کی تعلیم سے اس کی قوم اپنی ارتقائی منزل یا اپنی تمدنی حالت کے پیش نظر مستفید نہیں ہو سکتی تھی، نظر انداز کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر کی تعلیم اس کی اپنی قوم اور اپنے زمانہ کے کام آتی اور بعد میں اس کے خط و خال مسخ ہو گئے اور وہ عملی طور پر مٹ گئی، خالق کائنات کی حکمت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے تمدنی سیاسی اخلاقی اور جغرافیائی حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے آپ کی نظری تعلیم اور آپ کی عملی زندگی کی مثال میں فطرت انسانی کے تمام پہلو بے نقاب ہو گئے اور آپ کی تعلیم اور عملی زندگی کا پورا پورا اور قابل اعتماد ریکارڈ بھی تاریخ میں ضبط رہ گیا۔ بحکم ارشاد، انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون، لہٰذا نبوت آپ پر ختم ہو گئی، آپ کے ظہور پر نوع بشر کو بشارت دی گئی، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا، حضورؐ نے تمام انبیاء سے آگے جا کر انسان کی فطرت کے تمام اہم تقاضوں کو نہ صرف اپنی تعلیم سے بلکہ اپنی عملی زندگی کی مثال سے آشکار کیا مثلاً انسان کی خاندانی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کے بارہ میں حضورؐ کے سوائے کسی اور نبی کی تعلیم میں کوئی مفصل راہ نمائی نہیں ملتی حالانکہ انسان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی اس کی ساری اخلاقی زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ آپ نے شادیاں کیں۔ اپنے گروہ کو ایسے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے تیار کیا جو آپ کے پیغام کو مٹا دینا چاہتے تھے، ایک ریاست بنائی

اور اس کا انتظام کیا، اس کے اندر اور باہر غیر مسلموں سے خاص نوعیت کے تعلقات قائم کئے، فوجوں کی قیادت کی اور دشمن علاقوں کو فتح کیا۔ ہر تصورِ حیات کو اپنی کامیابی کیلئے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور اس قسم کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ضرورت تھی کہ بتایا جائے کہ تصورِ کامل کے پرستار ان حالات کا سامنا کس طرح سے کرتے ہیں۔ یہ ضرورت صرف آپ کی تعلیم اور مثال سے پوری ہوتی ہے۔

ایک کامل نبی پر نبوت کا اختتام وحدتِ خدا، اور وحدتِ انسانیت کا ایک لازمی نتیجہ ہے اگر انبیاء کا سلسلہ تاقیامت جاری رہتا تو اس بات کی امید کبھی نہ ہو سکتی کہ کسی وقت نوعِ انسانی ایک کامل نبی کی روحانی قیادت میں ایک کامل تصورِ حیات پر متحد ہو جائے گی۔

رسول کی مو بمو اطاعت کے بغیر ہماری محبت ترقی نہیں کر سکتی۔ جس طرح سے ایک دیئے سے دیا جلتا ہے اسی طرح سے رسول کا پیرو رسول کی محبت سے اپنے دل کی محبت کو زندہ کرتا ہے۔ جو شخص اپنے آپکو رسول کی اطاعت میں دیدیتا ہے وہ گویا ایک نیا جنم لیتا ہے یہ جنم اس کی محبت کا جنم ہے جس کے بعد اس کی محبت رسول کے علم سے تربیت پاکر اس طرح ترقی کرتی ہے جس طرح ایک نومولود بچہ ماں کے دودھ سے تربیت پاکر جسمانی نشوو نما حاصل کرتا ہے۔ ارتقاء کی حیاتیاتی (BIOLOGICAL) سطح پر زندگی نسلی توالد کے ذریعہ سے بڑھتی اور پھیلتی ہے یعنی حیوانات کی ایک قسم کے سارے افراد ایک باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس توالد میں قدرت متضاد جنسوں (OPPOSITE SEXES) کی باہمی کشش سے کام لیتی ہے ارتقاء کی نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL) سطح پر زندگی کے بڑھنے اور پھیلنے کا طریقہ ایک قسم کا نفسیاتی توالد ہے جس کے نتیجہ کے طور پر ایک نصب العین کو ماننے والے اپنے نصب العین کی محبت ایک ہی روحانی باپ سے حاصل کرتے ہیں اس توالد میں قدرت تابع اور متبوع کی باہمی کشش سے کام لیتی ہے جس طرح ایک جاندار وجود اپنی طرح کے دوسرے

جاندار وجود کو پیدا کرتا ہے اسی طرح ایک تصور اپنی طرح کے دوسرے تصور کو پیدا کرتا ہے یعنی ایک انسان کا تصور دوسرے انسان کا تصور بن جاتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلعم کے نور محبت یا علم سے بہرہ ور ہوں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم رسولؐ کی ذات پر اس طرح سے انحصار کریں جس طرح ایک جنین اپنی نشو و نما کیلئے ماں کے جسم پر پورا پورا انحصار کرتا ہے، فقط اسی صورت میں ہم اپنی محبت کا وہ جنم پا سکتے ہیں جس کے بعد محبت کا ارتقاء شروع ہوتا ہے۔ پھر رسولؐ کی پیہم اطاعت کی وجہ سے ہماری محبت کے ارتقاء کا ایک ایسا دَور بھی آئیگا جب دین کے اسرار ہم پر کھل جائیں گے۔ اور ہم نیک و بد کا ذاتی امتیاز کرنے لگ جائیں گے۔ ارتقائے محبت کے اس نقطہ پر ہمیں اعتقاد اور عمل میں رسولؐ کے ساتھ ایسی مشابہت حاصل ہوگی جو بیٹے کو شکل و صورت میں اپنے باپ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمیں رسولؐ کی روحانی ابنیت کا فخر حاصل ہوگا، قرآن میں بار ہا آل و اولاد کا لفظ ان لوگوں کیلئے استعمال ہوا ہے جو ایک آقا سے جذباتی اثر یا کسی تصور کی محبت قبول کرتے ہیں۔

جس طرح حرارت ایک بلند درجہ حرارت رکھنے والے جسم سے گذر کر کم درجۂ حرارت رکھنے والے اجسام میں جو اس سے چھوتے ہیں سرایت کرتی ہے یا جس طرح پانی ایک بلند سطح سے بہ کران مقامات کو سیراب کرتا ہے جو اس کے آس پاس نیچے کی سطح پر واقع ہوں، اسی طرح سے محبت یا دولتِ علم کی لہر اس مقام سے گذر کر جہاں وہ سب سے زیادہ بلندی پر ہوتی ہے نوعِ انسانی کو مستفید کرتی ہے۔ علم یا محبت کا نور پہلے ایک مقام پر فراہم ہوتا ہے اور پھر وہیں سے اردگرد میں پھیلتا ہے خاتم النبیینؐ کی ذات عالم انسانی میں محبت کا بلند ترین مقام ہے جہاں محبت کا پانی فراہم ہوتا ہے تاکہ نوعِ انسانی کی پیاس بجھائے، اگر ہم زندگی کے پانی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے سرچشمہ یعنی رسولؐ کی ذات کے ساتھ ایک گہرا دلی تعلق قائم کریں۔

ابدی اسلام

محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

مذہب کا ارتقائی تصوّر ہر ترقی یافتہ شے ابتداءً ایک ناقص نامکمل اور ادنیٰ صورت سے شروع ہوکر بتدریج اپنے منتہائے کمال کو پہنچتی ہے، لیکن اس کی ابتدائی صورت اور ترقی یافتہ حالت کے مابین کوئی نوعی فرق نہیں پایا جاتا ہے، یعنی اپنے منتہائے کمال پر پہنچنے کے بعد بھی، وہ شے وہی رہتی ہے، البتہ اس میں نئی نئی وسعتیں، گہرائیاں اور امتیازات پیدا ہو جاتے ہیں، اس معنے کر کے، ہر وجود متغیر بھی ہے، اور ابدی بھی، مذہب بھی ابتداءً، کائنات کے ناقص تصورات اور توجیہہ و تعلیل کے غیر حکمیاتی (UNSCIENTIFIC) طریقوں سے شروع ہوا، اپنی ابتدائی حالت میں وہ رسم پرستی اور اوہام و روایات کی آمیزش سے ملوّث تھا اس کے انداز بیان میں، افسانویت اور ڈرامائی کیفیت تھی۔ وہ زندگی کے فلسفیانہ حقائق اور عمومی قوانین کو مجرد تصورات کے ذریعہ نہیں، بلکہ مادی اور محسوس حقیقتوں کے ذریعہ، ظاہر کرتا تھا، پھر رفتہ رفتہ، اس میں ترقی ہوتی گئی۔ اوہام و خرافات کے عناصر میں کمی ہونے لگی۔ افسانوی طرز بیان کے ساتھ ساتھ، کہیں کہیں فلسفیانہ کلام بھی شامل ہوگیا۔ تشبیہ اور تجسیم (ANTHROPOMORPHISM) کی جگہ خدا کا تنزیہی تصوّر (TRANSCENDENTAL CONCEPTION) غالب آتا گیا۔ یہاں تک کہ جب انسانیت سنِ رشد کو پہنچی، تو اس کا مذہب بھی، ایک ترقی یافتہ نظامِ فکر کی صورت میں نمودار ہوا۔ مخالفین مذہب اس کی ابتدائی اور ناقص صورتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مذہب ہمیشہ سے سائنس اور علم و حکمت کا دشمن رہا ہے۔ اور اس نے اوہام پرستی اور روایات پرستی میں انسان کو مبتلا کر کے اسے ارتقائے فکری کی بلند تر منازل تک پہنچنے سے روک دیا ہے۔ لیکن مذہب کے دشمنوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ خود علوم و فنون اور سائنس و حکمت نہایت ابتدائی اور ناقص صورتوں سے ترقی کر کے موجودہ منزل تک پہنچے ہیں۔ ہمارا موجودہ علم ہندسہ، قدیم مصری فسلاحین، اور اہرام مصر کے

معماروں کے ناقص تجربات کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ ہمارا موجودہ علم ہیئت کلدانیوں کی کواکب پرستی سے شروع ہوا تھا۔ ہمارے تاریخی علوم انہیں خرافات و روایات کی پیداوار ہیں جن کے ذریعہ قدیم انسان اپنے ماضی کے واقعات کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہماری جدید کیمیا انہیں مہمل اور بے سود کوششوں سے وجود میں آئی ہے جو آب حیات کی تیاری اور دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی غرض سے، عرصہ دراز تک جاری رہیں۔ غرضیکہ آج جو علوم و فنون، تہذیب کا مایہ ناز ہیں وہ بھی اپنے آغاز و ابتدا میں نہایت ادنی اور ناقص تجربات سے ماخوذ تھے۔ اگر ہم ان علوم و فنون کی قدر و قیمت سے محض اس بناء پر انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ ان کی ابتداء نہایت سادہ اور ناقص تھی، تو ہم حیات اجتماعی کے اس علم (SCIENCE OF COLLECTIVE LIFE) کی قدر و قیمت کے کیونکر منکر ہو سکتے ہیں۔ جسے مذہب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذہبی تصورات نے بھی ایک ابتدائی اور ناقص حالت سے ترقی کی ہے۔ لیکن جس طرح انسانی شخصیت کے کمال پر اس واقعہ سے کوئی حرف نہیں آسکتا ہے کہ اس کی ابتدا ایک قطرہ خون سے ہوئی اور اسے شعور کی ادنیٰ ترین منزلوں سے گزرنا پڑا۔ اسی طرح مذہب کی صداقت پر اس امر سے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ہے کہ اس کا آغاز نہایت خام اور ناقص تصورات سے ہوا تھا۔

وحی و نبوّت کی حقیقت

یہ تو ظاہر ہے کہ قانونِ ارتقاء ایک ہمہ گیر قانون ہے جس کی کارفرمائی سے کوئی شعبۂ زندگی آزاد نہیں ہے۔ مذہبی تصورات و احکام بھی اس عالمگیر قانون کے عمل سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ البتہ مذہبی اصلاح و ترقی اور مذہبی تصورات کی توسیع کے سلسلہ میں قانون ارتقاء نے ایک نیا وسیلہ اور اچھوتا طریقہ اختیار کیا۔ جسے مذہبی اصطلاح میں وحی و نبوت یا الہام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وحی و الہام در حقیقت شعور مذہبی کی وہ

کامل ترین شکل ہے جس میں حقیقتِ ازلی اپنی ذات و صفات کا انکشاف کرتی ہے اور جس کے ذریعہ ہر زمانہ کے چند اشخاص اپنے دور کے مذہبی خیالات و اعمال کی توسیع و اصلاح کا کام انجام دے کر زمانۂ ماسبق کے مذہبی تصورات کی جگہ مذہب کا ایک بلند تر اور وسیع تر تصور پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نبی نے انبیائے ماسبق کی تعلیمات کی کامل نفی نہیں کی۔ بلکہ اپنے وسیع تر نظامِ فکر میں ان تعلیمات کو جذب کر لیا۔ کیونکہ قانونِ ارتقاء کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ اس کے اعلیٰ تر مدارج پست تر منازل سے بہت آگے نکل جانے کے باوجود انہیں اپنی وسعت میں سمو لیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارتقا کا ہر درجہ تمام سابقہ مدارج کا جامع ہوتا ہے اسی لئے قرآن نے تمام ادیانِ سابقہ کو منسوخ کر دینے کے باوجود، ان ادیان کے علمبرداروں کی تصدیق کی اور انبیاء و رسل کے درمیان کسی تفرق و امتیاز کو گوارا نہیں کیا۔ لا نفرق بین احدٍ من رسلہٖ کی تعلیم اسی حقیقت پر دلالت کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جن ادیان کو ہم ادیانِ باطلہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کسی وقت میں، انسان کی روحانی اور تمدنی ضروریات کے کفیل تھے لیکن جب کسی مذہبی شخصیت نے اپنے پختہ تر اور زیادہ ترقی یافتہ مذہبی شعور کے ذریعہ، اس منزل سے آگے قدم بڑھایا اور دنیا کو ایک کامل تر مذہبی تصور سے آشنا کیا۔ اس وقت سے تمام سابقہ ادیان ناکارہ اور منسوخ پائے۔ ہر نئے نبی نے وحی و الہام کے ذریعہ جن مذہبی حقائق کا ادراک کیا، وہ انبیائے سابق کے مذہبی تصورات و تعلیمات کی بہ نسبت زیادہ جامع اور ترقی یافتہ تھے۔ اس طرح وحی و الہام درحقیقت قانونِ ارتقائے مذہب کا ایک وسیلہ تھا۔ یہاں پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر قانونِ ارتقاء کا عمل ہر جگہ یکساں ہے تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو ترقیات ہوئیں۔ اُن میں فطرت نے وحی و الہام کا طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا۔ یا یوں کہیے کہ اگر قانونِ ارتقاء نے مذہبی دائرہ میں

وحی والہام اور دیگر شعبوں میں عقل وفکر سے کام لیا۔ تو اس سے ارتقائی عمل کی یکسانیت میں فرق لازم آتا ہے۔ یہ شبہ وحی والہام کو عقل وفکر کے منافی قرار دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ فطرت کی ہدایت ورہنمائی جسے ہم وحی والہام سے موسوم کرتے ہیں کسی ایک شعبہ حیات کے لئے مختص نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی علم وفن اور زندگی کا کوئی شعبہ وحی والہام کی ہدایت سے مستغنی نہیں ہے۔ اگر فطرت کی رہنمائی انسان کی کوششوں کو صحیح رخ پر نہ لگاتی، تو علوم وفنون کے کسی شعبہ میں ترقی ناممکن ہو جاتی اس لحاظ سے ہر علم اور ہر پیشہ الہامی ہے، وحی والہام اور عقل وفکر دو متضاد حقیقتیں نہیں ہیں۔ بلکہ فطری ہدایت ورہنمائی کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ جن میں اوّل الذکر ایک بلند تر سطح پر کارفرما ہے۔ اور ثانی الذکر ادنیٰ سطح پر۔ لیکن اس کے باوجود ان میں کوئی داخلی تضاد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے انبیائے کرام کی تعلیمات میں کوئی بات منافی عقل نہیں ہے۔ بلکہ انسانی فہم وتفکر سے ان کی تصدیق ہوتی ہے، فطرت کی ہدایت ورہنمائی کی۔ ادنیٰ ترین شکل حیوانات میں پائی جاتی ہے۔ جسے جبلت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انسان میں یہی قوت عقل وفکر کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ انسان ابھی تک حیوانیت کی منزل سے پوری طرح نجات نہیں پا سکا ہے۔ اس لئے اس میں دیگر حیوانات کی طرح جبلّتوں کا وجود بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد حیوانوں کی بہ نسبت انسان میں کم ہے۔ کیونکہ فطرت نے اسے عقل وفکر کی قوت سے بھی نوازا ہے۔ جس نے ایک حد تک انسان کو ہدایت فطری کی اس شکل سے بے نیاز کر دیا ہے۔ لیکن فطری ہدایت کی ایک شکل جو سب سے اعلیٰ تر ہے وحی والہام کی صورت میں ظہور کرتی ہے یہ قوت جبلّت، وجدان اور عقل وفکر سب سے بالاتر اور سب کی جامع ہے۔ لیکن اس کا وجود عام نہیں ہے۔ بلکہ چند مخصوص انسانوں تک محدود رہا ہے، انہی ممتاز ہستیوں کو ہم نبی یا رسول کہتے ہیں۔ فطرت جس طرح جبلّت اور وجدان

کے ذریعہ اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے۔ اسی طرح عقل و فکر کو بھی اپنے انکشافات
واسطہ بناتی ہے۔ لیکن اس سے بھی بلند تر سطح پر فطرت کے انکشافات کا ایک ذریعہ
وحی و الہام ہے۔ یہ کوئی بیرونی یا خارجی قوت نہیں ہے جو ہماری صحیح جبلتوں، صحیح
وجدانات یا عقل سلیم کے منافی ہو۔ بلکہ فطرت کی وہ اندرونی رہنمائی ہے جس میں
جبلت، وجدان اور عقل ہم آغوش ہیں۔ اس بات کا ثبوت کہ وحی و الہام، درحقیقت
فطرت کی رہنمائی کا ایک ترقی یافتہ طریقہ ہے اور جبلت، وجدان اور عقل جس کے
ذریعہ فطرت حیوانات اور عام انسانوں کی رہنمائی کا کام سرانجام دیتی ہے، اسی ترقی
یافتہ طریق ہدایت کی ادنیٰ اور معمولی صورتیں ہیں۔ قرآن کی ان آیات سے بھی ملتا ہے
جن میں وحی کی اصطلاح، بے جان اشیاء اور حیوانات کے فرائض کے سلسلہ
میں استعمال کی گئی ہے، قرآن میں وحی کا لفظ صرف اس طریق ہدایت کے متعلق
نہیں استعمال ہوا ہے۔ جس کے ذریعہ فطرت انبیاء اور رسولوں کی تعلیم و تربیت کرتی
ہے۔ بلکہ عام انسانوں اور حیوانوں کو جس طرح فطرت اپنے رموز سے باخبر کرتی
ہے۔ اس کے لئے بھی یہی لفظ قرآن میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً قرآن کہتا ہے:۔
وان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم (شیاطین اپنے دوستوں سے سرگوشیاں
کرتے ہیں) واذ اوحیت الی الحواریین ان آمنوا بی وبرسولی (جب میں
نے حواریوں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ مجھ پر اور میرے رسولوں پر ایمان لائیں)
فخرج علی قومہ من المحراب فاوحی الیہم ان سبحوہ بکرۃ وعشیا (وہ یعنی زکریا
محراب سے نکل کر اپنی قوم سے مخاطب ہوا، اور کہا کہ اللہ کی تسبیح صبح و شام کیا کرو)
واوحی فی کل سماء امرھا (اور اللہ تعالےٰ نے ہر آسمان کو اس کا حکم سنایا) واوحی
ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا (اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو
ہدایت کی کہ وہ پہاڑوں میں گھر بنالے) ان آیات میں ایک جگہ شیطانوں کی مخفی

سرگوشیوں کے لئے وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ حواریوں کے دل میں خیال پیدا کرنے کو وحی کہا گیا ہے۔ ایک جگہ شہد کی مکھی کے وجدان کیلئے وحی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ایک جگہ آسمان پر وحی کرنے کا ذکر ہے۔ غرضیکہ اس لفظ کے متفرق طور پر استعمال کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کا وحی و الہام اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ جس کے ذریعہ خلاق قدرت، حیوانات اور عام انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ البتہ ان اشکال کے مدارج میں بہت بڑا فرق ہے جس طرح ماہرین فن اپنی اپنی ایجادات و اختراعات میں فطرت کی اندرونی رہنمائی سے مستغنی نہیں ہو سکتے ہیں۔ اور جب کسی شعبہ فن میں اس کے ماہر کو کوئی نئی بات سوجھتی ہے تو وہ فطرت کی اندرونی ہدایت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح انبیاء اور رسولوں نے ہادی فطرت سے جو تعلیمات اخذ کئے ہیں وہ بھی اسی اندرونی الہام کا نتیجہ ہیں۔ یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ ان پر خارج سے کوئی قوت عمل کرتی ہے۔ اس طرح جبلّت و وجدان، عقل و فکر اور وحی و الہام تینوں ایک ہی طریق ہدایت کی مختلف شکلیں ہیں جن میں سے ہر ایک بتدریج دوسری سے بہتر اور زیادہ کامل ہے۔ ارتقاء کا عالمگیر قانون اس شعبہ میں بھی اسی طرح کارفرما ہے جس طرح اور شعبہ ہائے حیات میں۔ لیکن علماء اور مفکرین اور ماہرین فنون پر جو انکشافات ہوتے ہیں ان سے صرف جزوی حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یعنی ان اشخاص پر فطرت اور زندگی اپنے کسی مخصوص پہلو کا انکشاف کرتی ہے۔ لیکن کل حقیقت اپنے تمام پہلوؤں اور کامل صفات کے ساتھ صرف انہیں ہستیوں پر منکشف ہوتی ہے جنہیں فطرت اپنے مخصوص اغراض کے لئے نبی اور رسول کے منصب پر فائز کرتی ہے۔ اس لئے علماء، مفکرین اور ماہرین فن کا اتباع زندگی کے جزوی امور میں جائز اور درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی کی کلّی ہدایت کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ ذریعہ انبیاء کی تعلیم ہے جو عالم

کی متضاد حقیقتوں کا بصورت کل اور بشکل وحدت ادراک کرتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ وحی والہام کا یہ سلسلہ کیوں ختم ہوگیا۔ جس کے ذریعہ نہ صرف مذہب نے اپنی موجودہ صورت تک ترقی بلکہ ہر علم وفن میں ارتقاء کا آغاز ہُوا۔ بالفاظ دیگر مذہب اور علوم وفنون کے دائرے میں فطرت نے اب راست ہدایت کا طریق کیوں ترک کر دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک انسان کے قوائے عقلی میں نشوونما نہیں ہوُا تھا اور اس کے آلات فکر، ناقص اور غیر ترقی یافتہ تھے۔ اس وقت تک فطرت اس کی راست ہدایت کرتی تھی۔ لیکن جب اس کی حسیات، اس کی عقل وفکر اور اس کے ذہن میں پختگی پیدا ہوگئی۔ تو فطرت نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا، کہ اب، سابقہ وحی والہام کی مدد اور اپنے ترقی یافتہ آلات فکر کے ذریعہ اپنی اجتماعی فلاح وصلاح کا راستہ خود تلاش کرے " اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے معنی یہی ہیں کہ خالق فطرت کو انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لئے جو کچھ کرنا تھا، وہ کر چکا۔ اس نے انسان کے اجتماعی سود وزیان کا قانون اس پر واضح کر دیا ترقی کی راہوں کی نشان دہی کر دی علوم و فنون کو ایک خاص منزل ترقی تک پہنچا دیا۔ اب انسان کو اس کی طرف سے کسی نئی ہدایت ورہنمائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ بلکہ جو کچھ اسے اب تک دیا گیا ہے، اس کی روشنی میں اور اپنی عقل وفکر کی مدد سے آگے بڑھنا چاہیئے۔

مذہب نے ہمیں کیا دیا ہے

الہامی مذاہب نے ہمیں جو تعلیم دی ہے۔ اس میں بعض امور مقامی ماحول اور ملکی خصوصیات سے متعلق ہیں۔ جن میں مختلف مذاہب کا آغاز وارتقاء ہُوا تھا۔ یہ امور ہر زمانہ میں بلحاظ تبدیلی حالات بدلتے رہے ہیں۔ اور آئندہ بھی تغیر پذیر رہیں گے۔ ان متبدل حقیقتوں کو ہر الہامی شریعت نے یکے بعد دیگرے منسوخ قرار دیا۔ قرآن نے بھی ان امور میں نسخ وتبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ انہیں متبدل اور تغیر پذیر

احکام مذہب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، مَا نَنسَخ مِن آیَۃٍ اَو نُنسِھَا نَاْتِ بِخَیرٍ مِنھَا اَلَم تَعلَم اَنَّ اللّٰہَ عَلیٰ کُلِّ شَیٍٔ قَدِیرٌ، (جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں، یا بھلا دیتے ہیں۔ ہم اس سے بہتر آیت لے آتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی احکام میں ترمیم و تبدیلی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے۔ اور رہے گا۔ لیکن یہ تبدیلیاں ہمیشہ ترقی کی جانب لے جاتی ہیں چنانچہ جب قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ ہم ایک آیت کو منسوخ کر کے اس سے بہتر آیت لے آتے ہیں، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احکام کی تبدیلی رجعت نہیں بلکہ ترقی کی جانب ایک مزید اقدام ہے۔ خود قرآن مجید کی کئی ایک آیتیں منسوخ خیال کی جاتی ہیں، مثلاً ایک خیال یہ ہے کہ آیت اُحِلَّ لَکُم لَیلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلیٰ نِسَآئِکُم ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُم وَ اَنتُم لِبَاسٌ لَّھُنَّ، (رمضان کی شب میں تمہارے لئے اپنی بیویوں سے، ہمبستری کو حلال کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم ان کے لئے) کے ذریعہ ایک سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح، کُتِبَ عَلَیکُم اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ المَوتُ خَیرَ نِ الوَصِیَّۃُ (جب تم میں سے کسی کی موت قریب آئے تو اُس پر وصیت فرض کی گئی ہے) کی آیت کو ایک روایت کے مطابق یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اَولَادِکُم لِلذَّکَرِ مِثلُ حَظِّ الاُنثَیَینِ، (اللہ تعالیٰ تمہیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ لڑکوں کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دو) سے منسوخ کیا گیا ہے پہلی آیت میں مسلمانوں کے لئے وصیت کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ لیکن دوسری آیت میں ورثاء کے حصے مقرر کر کے اس فرضیت کو ساقط کر دیا گیا۔ جس سے مسلمانوں پر اب یہ فرض نہیں رہا کہ وہ وصیت ضرور کریں۔ بعض علماء قرآن میں پانچ سو آیتوں کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک قرآن میں صرف پانچ آیتیں منسوخ ہیں۔ شاہ صاحب نے نسخ آیات کی ایک اور توجیہہ بھی کی ہے وہ لکھتے ہیں۔ کہ قرآن میں کوئی حکم مطلقاً منسوخ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ایک مضمون کو

پہلے مطلق بیان کیا جاتا ہے بعد میں پھر اسے مقید کر دیا جاتا ہے۔ مکی سورتوں میں عموماً کلیات اور اصول
بیان کئے گئے ہیں پھر مدنی سورتوں میں ان اصول و کلیات کو عصری حالات پر منطبق کر کے دکھایا گیا ہے۔ ان
میں سے جو رائے بھی صحیح ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کے اصول و کلیات کا اطلاق ہر زمانہ کے حالات پر عائد
ہوگا اور اس لئے احکام میں بھی ترمیم و تبدیلی لازم آئے گی۔ حضرت عمرؓ کے بعض اجتہادات
سے بھی اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے بلحاظ مصالح اور حالات
اسلام کے جزوی احکام میں تبدیلی فرمائی۔ اور اس تبدیلی پر دوسرے صحابہ نے کوئی
اعتراض نہیں کیا۔ مثلاً قرآن نے چوری کی سزا قطع ید مقرر کی ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں
کہا ہے کہ اس حکم کے نفاذ کو کسی صورت میں معطل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود حضرت
عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں ممانعت فرما دی کہ چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ اسی طرح
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن حضرت
عمرؓ نے اس اجازت کو واپس لے لیا اور عورتوں کو مساجد میں جانے سے روک دیا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ میں سے مولفۃ القلوب کا حصہ نکالتے تھے جس کا حکم
قرآن میں بھی موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں مولفۃ القلوب کو ان کا حصہ دینے
سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اب اسلام کو قوت حاصل ہو گئی ہے اور تالیف قلوب
کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ ارکان حج میں سے ایک رکن یہ ہے کہ طواف کعبہ
کرتے ہوئے مسلمان اکڑ اکڑ کر چلیں۔ اس حکم کی علت یہ تھی کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ
میں کافروں کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ اسلام لانے کی وجہ سے مسلمانوں میں جسمانی ضعف
پیدا ہو گیا ہے۔ اس خیال کو دور کرنے کے لئے اور مسلمانوں کی قوت کا اظہار کرنے
کی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ حکم دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس
حکم کو منسوخ تو نہیں کیا۔ لیکن کئی بار یہ خیال ظاہر کیا کہ اب اس حکم پر عمل کرنے کی ضرورت
نہیں رہی ہے۔ کیونکہ جس علت کی بنا پر یہ حکم دیا تھا وہ باقی نہیں رہی ہے۔ ان تمام

باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ حالات کی تبدیلی کے باعث اگر کسی حکم کی علت ساقط ہو جائے تو اس حکم کو معطل یا تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مذہب کے جزوی احکام میں بلحاظ حالات تبدیلی ممکن ہے۔ لیکن مذہب کا ایک پہلو دائمی اور ابدی ہے جس میں قطعاً کوئی تغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ اسلام کے ان ناقابل تغیر اور ابدی اصولوں کو قرآن اُمّ الکتاب کہتا ہے۔ منہ آیات محکمات ھن اُمّ الکتاب و آخر متشابھات (وہی اللہ ہے جس نے تجھ پر کتاب نازل کی ہے جس میں آیات محکمات ہیں۔ یہی کتاب کی روح اور اس کی بنیاد ہیں، دوسری آیات متشابہات ہیں) یعنی آیات محکمات کتاب الٰہی کے بنیادی اصولوں اور کلیات کی تعلیم دیتی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آسکتی ہے۔ باقی جن آیتوں میں جزوی احکام درج ہیں ان کا تعلق مذہب کے دائمی اور ابدی پہلو سے نہیں ہے۔

اسلام کے ابدی اصول

اب سوال یہ ہے کہ اسلام کے وہ اجزاء کون سے ہیں، جن میں تغیر احوال سے کوئی فرق نہیں آسکتا ہے اور جو ہر قسم کی ترمیم و تنسیخ سے ماوراء اور ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے ابدی پہلو دو ہیں ایک تو زندگی اور کائنات کے بارے میں اس کا عمومی نقطہ نظر ہے۔ اور دوسرے اقوام و ملل کے عروج و زوال، انسانی سعادت و شقاوت اور اجتماعی سود و زیاں کے بارے میں اس کا ایک مخصوص نظریہ ہے۔ جس سے وہ انقلابات تاریخ کی توجیہہ و تشریح کرتا ہے۔ پھر اس آخر الذکر نظریہ کی تشریح سے وہ انسان کی سیاسی معاشی اور تمدنی زندگی کے متعلق بعض اصول اور بدیہیات اخذ کرتا ہے۔ جو اس کے نظریہ کی رو سے ہر دور اور زمانہ کے معاشرتی اور تمدنی حالات پر یکساں صادق آتے ہیں۔ ان اصول و بدیہیات کی بنا پر وہ اپنے زمانہ کے حالات کی اصلاح کے لئے بعض جزوی احکام وضع کرتا

کرتا ہے۔ انہیں تفصیلی احکام میں بلحاظ تبدیلی حالات ترمیم و تغیر ممکن ہے۔ البتہ قرآن نے اجتماعی زندگی کی فلاح و صلاح کے بارے میں جو اصول و کلیات قائم کئے ہیں۔ ان میں زمانی اور مکانی تبدیلیوں سے کوئی فرق نہیں واقع ہو سکتا ہے کیونکہ ان حقائق کا تعلق زندگی کے غیر متغیر اور ابدی پہلو سے ہے۔ جیسا کہ ہم ارتقائی عمل کی بابت اس سے قبل بتا چکے ہیں کہ اس میں نہ خالص تغیر ہے اور نہ محض ثبات و دوام بلکہ یہ دونوں عناصر یکجا اور ہم آغوش ملتے ہیں۔ مذہب بھی چونکہ ارتقا کے عالمگیر قانون کا پابند ہے، اس لئے اس کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک غیر متغیر ابدی اور لازوال ہے۔ دوسرا جو تفصیلی احکام سے متعلق ہے۔ زمانہ اور حالات کی تبدیلیوں کے تابع ہے۔

اسلام کا کائناتی نظریہ

اب ہم اسلام کے نظریہ کائنات اور فلسفہ تاریخ سے بحث کریں گے۔ جن پر اس کے تمام جزوی احکام کا دارومدار ہے اور جو اس کے ابدی اور ناقابل تغیر اصولوں کا ماخذ ہیں۔ اس کے بعد ہم ان کلیات پر روشنی ڈالیں گے جو قرآن نے اپنے نظریہ کائنات اور تاریخ سے مستنبط کئے ہیں۔ اور جن پر مذہب کی تفصیلی تعلیمات مبنی ہیں جہاں تک اسلام کے نظریہ کائنات کا تعلق ہے یہ وہی چیز ہے جسے توحید کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ توحید ایک ایسا سائنٹیفک نظریہ کائنات ہے جس کے بغیر علوم و فنون اور تمدن میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی ہے۔ انسانی تہذیب نے آج تک جتنے منازل ارتقاء طے کئے ہیں وہ سب اس تعلیم کی بدولت امکان سے فعل میں آئے۔ جسے توحیدی مذاہب نے دنیا کے سامنے وقتاً فوقتاً پیش کیا تھا، یہ نظریہ دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ اولاً یہ کہ کائنات پر مختلف اور قائم بالذات قوتوں کی حکمرانی نہیں ہے بلکہ اس کے تمام شعبہ جات اور جملہ مظاہر کے اندر

ایک ہی حقیقی قوت کارفرما ہے۔ واقعات ومظاہر کی کثرت سے یہ دھوکا نہیں ہونا چاہئے کہ زندگی کا ہر واقعہ منفرد اور ہر مظہر مستقل ہے۔ بلکہ عالم کے تمام واقعات پر ایک کلی قانون کی حکومت ہے۔ توحید کا بنیادی تصور یہی ہے۔ اسی قانون واحد کی ہمہ گیر فرمانروائی کا تصور پیش کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے۔ لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا۔ اور معبودوں کی حکومت ہوتی تو ان میں فساد اور انتشار پھیل جاتا، کائنات کا یہ توحیدی نظریہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی تشکیل فکر پر کتنا موثر تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ وبائے عمواس کے موقعہ حضرت عمرؓ نے شام سے اسلامی افواج کی منتقلی کا حکم دیا۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے جو فوج کے کمانڈر تھے، یہ اعتراض کیا کہ یہ عمل تقدیر الٰہی سے فرار کے مترادف ہوگا۔ اس کا جواب حضرت عمرؓ نے یہ دیا کہ نعم افر من قضاء اللہ الیٰ قضاء اللہ۔ (یعنی میں خدا کی ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف بھاگتا ہوں) اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ قانون الٰہی کی وحدت کو، جملہ اختلافات عالم اور مظاہر و واقعات کی کثرت میں جاری و ساری محسوس کرتے تھے، حضرت ابو عبیدہ کو، جو بات وہ سمجھانا چاہتے تھے، وہ یہ تھی کہ اگر وبائے عمواس قانون الٰہی کے تحت ظاہر ہوئی تھی تو اس کے مقابلہ میں، جو حفاظتی تدابیر اختیار کی جائیں گی وہ بھی اسی قانون کے عمل کا دوسرا رخ ہوں گی اس لئے خدا کی ان دونوں تقدیروں کے مابین کوئی حقیقی تضاد نہیں ہے۔ توحیدی نظریہ کائنات کے اس طرز فکر کے ساتھ۔ ایک اور تصور بھی وابستہ ہے۔ یعنی کائنات کے مختلف واقعات ومظاہر کی حقیقت سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انہیں ایک کل کے اجزاء کی حیثیت سے دیکھا جاتے اور یہ غلطی نہ کی جائے کہ کسی جزو کو کل قرار دے لیا جاتے۔ کیونکہ اس سے جزوی صداقتوں کی پرستش لازم آئے گی۔ حالانکہ صداقت ایک کل ہے۔ جس کے مختلف اجزاء۔ اور پہلو ہوتے ہیں اور کسی ایک پہلو یا جزو کو کل

حقیقت سمجھ لینے سے باقی اجزاء کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی غلطی پر تنبیہ کرتے ہوئے قرآن نے کفار کے متعلق فرمایا ہے۔ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون فی الارض ادہ اس چیز کو علیحدہ کر دیتے ہیں۔ جسے اللہ نے ملانے اور جوڑنے کا حکم دیا ہے اور اس کی وجہ سے زمین میں فساد پیدا کرتے ہیں، یعنی کفار ایک کُلّی حقیقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھتے ہیں، یہ دونوں تصورات یعنی کائنات کا ایک واحد قانون کے زیر فرمان ہونا اور حقیقت کا ایک کلیت (TOTALITY) ہونا جس کے اجزاء کی فرداً فرداً پرستش کفر و گمراہی ہے۔ تمام علم و فن اور سائنس و حکمت کی بنیاد، اور احساس کار ہیں۔ جن کے بغیر دنیا میں علم اور سائنس ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی ہے لیکن یہ دونوں تصورات عقیدہ توحید کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر توحیدی مذاہب میں وجود میں نہ آتے اور بالخصوص اسلام نے انسان کو جزوی صداقتوں کی پرستش سے آزاد نہ کروایا ہوتا۔ تو سائنس اور علوم و فنون کا فروغ قطعاً ناممکن ہو جاتا۔ کائنات کے اس توحیدی تصور کے ظہور میں آنے سے پہلے انسان مظاہر کی کثرت کے پس پشت کوئی حقیقی وحدت نہیں پاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اُسے ہر مظہر فطرت کے اندر ایک مستقل قوت کی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ اس کا عقیدہ یہ تھا، کہ کائنات میں بے شمار خود مختار قوتیں کام کر رہی ہیں، جن میں ہر ایک کا دائرہ عمل دوسرے سے جدا ہوتا ہے، اسی کثرت پرستی نے بے شمار خدا اور دیوتا پیدا کر رکھے تھے۔ جب تک کائنات کی حقیقت کے متعلق یہ انداز فکر باقی تھا، اس وقت تک انسان واقعات عالم کو علّت و معلول کے ایک سلسلہ کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور نہ مظاہر کے اسباب کی تلاش و جستجو، اس کے لئے ممکن تھی۔ اس کی نگاہ میں ہر واقعہ یکتا اور منفرد ہوتا تھا، جس کی علت بھی ان معنی کر کے منفرد تھی کہ دوسرے واقعات کی علّتوں سے اس کا کوئی ربط نہیں ہو سکتا تھا، واقعات عالم

کے اسباب پر غور کرتے ہوئے اس کی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ کائنات کی بے شمار خود مختار قوتوں، یا دیوتاؤں اور دیویوں میں سے کسی ایک نے راست مداخلت کر کے ہر جداگانہ واقعہ کی تخلیق کی ہے، توحیدی مذاہب نے اس نظریہ کا بطلان کیا۔ اور بتایا کہ جملہ واقعات و مظاہر کی علت ایک ہے۔ عالم میں متعدد خداؤں یا قوتوں کا دخل نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ایک ہی خدا یا قوت کے اثر سے ہوتا ہے، اس طرح عقیدہ توحید نے مظاہر کی کثرت کو ایک واحد قوت یا قانون کا معلول قرار دے کر سائنس اور علم کا راستہ صاف کیا۔ لیکن اس توحیدی نظریہ کو بھی عوام الناس پوری طرح نہیں سمجھ سکے، انہوں نے ایک خدا کا وجود تو تسلیم کر لیا لیکن عقیدہ توحید سے وحدت قوانین کا جو نظریہ مستنبط ہوتا ہے۔ اس کے فہم و ادراک سے عاجز رہے۔ یہ تصور کہ خدا کی وحدانیت کے اقرار سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم جملہ واقعات عالم کو ایک کل کے اجزاء کی حیثیت سے دیکھیں اور حالات و تغیرات کے اندر جو منظم ترتیب اور باقاعدگی پائی جاتی ہے، اس کا بھی ادراک و احساس کریں عامۃ الناس کے فہم سے خارج رہا۔ توحیدی مذاہب کے پیرو بھی بالعموم ہر واقعہ کو یکتا اور منفرد سمجھتے رہے۔ انہوں نے ایک واقعہ اور دوسرے واقعہ کے درمیان کسی علّی ربط کو معلوم کرنے کے لئے جستجو اور تحقیق کی ضرورت نہیں محسوس کی، یہ ظاہر ہے کہ اگر عالم میں صرف ایک ہی خدا کی مشیت کارفرما ہے تو تمام واقعات عالم کو اسی ایک عمومی مشیت کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہر واقعہ میں ایک جداگانہ مشیت الٰہی کارفرما ہو۔ گویا کہ خدا کی مشیتیں بھی اتنی ہی ہیں جتنے دنیا کے واقعات لیکن توحید کے پیرو بھی، بالعموم ہر واقعہ میں خدا کی ایک جداگانہ مشیت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں اور اس واحد اور عمومی مشیت کے قانون کی تلاش نہیں کرتے جس کے تحت خدا کی جزئی مشیت جداگانہ واقعات صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ توحید کا یہ

عامیانہ تصور انسان کو اسی کثرت پرستی کی طرف لے جاتا ہے جس سے مذہب نے اُسے نجات دلانے کی کوشش کی تھی، یہ بات کہ سائنس مادہ اور حیات کے آئندہ طرزِ عمل (BEHAVIOUR) کے بارے میں پیش قیاسی کر سکتی ہے، اور یہ پیش قیاسیاں اکثر و بیشتر صحیح ہوتی ہیں اسے کیونکر حاصل ہوئی۔ محض اس وجہ سے کہ سائنسدانوں نے قوانینِ قدرت کی وحدت کا قوی ادراک کر لیا ہے اور عالمِ مادی، نیز علم الحیات کے دائرہ میں مشیت الٰہی جس انداز سے کارفرما ہے اس کا اصول انہوں نے دریافت کر لیا ہے۔ اسی اصولِ واحد کی مدد سے وہ اشیاء طبعی اور حیاتیاتی عضویات کے آئندہ عمل کے بارے میں پیش قیاسی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر انسان کی اجتماعی فلاح و بہبود اور شکست و انحطاط کا کوئی واحد قانون ہے۔ بالفاظ دیگر اگر تاریخی واقعات اور تہذیبوں کے عروج و زوال میں مشیت الٰہی کسی واحد اصول یا قانون کے مطابق کارفرما ہے۔ تو اس اصول کے انکشاف سے انسان اپنی اجتماعی زندگی کے آنے والے نتائج کا اندازہ کر سکتا ہے اور ان نتائج سے محفوظ رہنے یا اگر وہ مطلوب ہوں تو انہیں قریب تر لانے کے اسباب فراہم کر سکتا ہے۔ اگر عقیدہ توحید مشیت الٰہی کے اس واحد اصول کی جانب ہماری رہنمائی نہ کر سکا، تو اس کا ایک بہت بڑا فائدہ معدوم ہو جائے گا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ توحید اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے بشرطیکہ ہم اسے مشیت الٰہی کے واحد اصول و قانون کی حیثیت دیں، اور اس غلط طرزِ فکر کو ترک کر دیں۔ جس کے باعث انسان ہر جزوی مشیت کو جس طرح کہ وہ انفرادی واقعات میں ظاہر ہوتی ہے۔ مستقل اور قائم بالذات سمجھنے لگا ہے۔ اس کے بجائے ہمیں مشیت الٰہی کا ایک عمومی اور کلی تصور قائم کرنا چاہیئے، تاکہ اس کی رو سے ہم انفرادی واقعات کی توجیہہ و تعلیل کر سکیں، اور ہر واقعہ کو براہِ راست

خدا کی مرضی سے منسوب نہ کریں، قرآن نے توحید کا جو تصور پیش کیا ہے وہ یہی ہے کہ خدا کی مشیت کا ایک قانون ہے اور جملہ تغیرات عالم اور واقعات تاریخ اسی قانون کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ چنانچہ اس وحدت قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ (اللہ کی فطرت وہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا اور خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے)۔ اسی طرح وہ اس قانون کی عدم تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ولن تجد لسنة اللہ تبدیلا۔ جس کا مطلب صرف یہی ہے کہ واقعات و مظاہر کی عام تبدیلیاں ایک قانون کی تابع ہیں۔ جس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ دین کی اصل روح اور بنیاد نیز اس کا وہ پہلو بھی جس میں تغیر و تبدیلی ناممکن ہے۔ اسی قانون حیات یا قانون کائنات سے تعلق رکھتا ہے، اور قرآن نے جہاں کہیں انسانوں سے اطاعت الٰہی کا مطالبہ کیا ہے وہاں اس کی مراد یہی ہے کہ اس کے قانون کائنات اور قانون حیات کی اطاعت کی جائے۔ اس بات کو سمجھانے کے لئے کہ خدا کی مشیت کا ایک واحد قانون ہے جس میں کوئی بے ضابطگی نہیں پائی جاتی ہے اور جس کے مطابق تمام طبعی اور تاریخی تغیرات واقع ہوتے ہیں اور یہ کہ انسانی فلاح و سعادت کا دار و مدار اس قانون کو ٹھیک طور پر سمجھنے اور صحیح طور پر برتنے میں ہے، قرآن، زمین و آسمان کی بیشمار نشانیوں سے استشہاد کرتا ہے۔ جنہیں وہ آیات کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ کافروں پر اس کا سارا الزام یہی ہے کہ وہ ان آیات الٰہی پر غور نہیں کرتے ہیں جن سے مشیت الٰہی کے قانون کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ وکاین من آیة فی السموات والارض یمرون علیہا وھم عنہا معرضون (اور کتنی ہی نشانیاں ہیں زمین و آسمان میں جن پر سے وہ گزرتے ہیں اور جن کی طرف سے وہ روگردانی کرتے ہیں)

اس کے معنی یہی ہیں کہ جب کسی گروہ میں اس قانون کو سمجھنے اور برتنے کی اہلیت نہیں رہتی ہے جس کے مطابق عالم طبعی کے تغیرات اور اجتماعی زندگی کے انقلابات پیش آتے ہیں تو وہ قوم دنیوی و اخروی سعادتوں سے محروم ہو جاتی ہے

قرآن میں امم سابقہ کی شکست، وانحطاط اور زوال و نامرادی کی داستان جہاں کہیں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مشیت الٰہی کے طریق کار اور اصول کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کریں نیز ان نتائج و عواقب سے بچنے کی کوشش کریں جو مشیت الٰہی کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں تک عالم فطرت کے تغیرات، واقعات کا تعلق ہے۔ قرآن نے بار بار انسان کو ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ طبعی واقعات و حوادث ایک فطری قانون کے پابند ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔ ھوالذی جعل لکم الیل لتسکنوا فیہ والنہار مبصرا ان فی ذالک لآیات لقوم یسمعون (وہی ہے جس نے رات بنائی تاکہ اس میں تم سکون حاصل کرو اور دن بنایا تاکہ اس میں تم دیکھو سکو۔ اس میں ایسی قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو سنتی اور سمجھتی ہے) ھوالذی مد الارض وجعل فیہا رواسی وانہاراً ومن کل الثمرات جعل فیہا زوجین اثنین یغشی الیل النہار ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون۔ (وہی ہے جس نے زمین کی طنابیں کھینچیں، پھر اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں اور پھلوں میں اس نے جوڑے جوڑے پیدا کئے، دن کو رات ڈھانپ لیتی ہے، ان تمام چیزوں میں سوچنے والی قوم کے لئے نشانیاں ہیں) ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماءٍ فاحیا بہ الارض بعد موتہا

وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریح والسحاب المسخر بین السماءِ والارض لاٰیت لقوم یعقلون (زمین اور آسمان کی خلقت میں دن اور رات کے اختلاف میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں اور جن سے انسانوں کو نفع ہوتا ہے اور جو کچھ پانی کی شکل میں اللہ تعالےٰ آسمان پر سے اتارتا ہے جس کی وجہ سے زمین کو دوبارہ زندگی حاصل ہوتی ہے اور چوپایوں میں جو اس نے ساری زمین میں منتشر کر رکھے ہیں اور ہواؤں کے بدلنے میں اور زمین وآسمان کے درمیان بادلوں کے وجود میں، اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے بہرہ ور ہو) اولم یروا الی الارض کیف انبتنا فیہا من کل زوجٍ کریم ان فی ذلک لاٰیۃ (کیا تم نے زمین کی طرف نہیں دیکھا۔ کہ ہم نے کس طرح اس میں پودوں کے جوڑے بو دیئے اس میں ایک نشانی ہے) ان تمام آیتوں میں قرآن مظاہر فطرت کی یکرنگی اور یکسانیت کو آیات الٰہی قرار دیا ہے لیکن یہ کس بات کی علامات یا نشانیاں ہیں۔ جہاں تک مشاہدہ فطرت کا تعلق ہے، مومن اور کافر سبھی ان مظاہرِ قدرت کو دیکھتے ہیں۔ دن اور رات کا تواتر موسموں کے باقاعدہ تغیرات رنگ اور زبان کا اختلاف، یہ چیزیں ہر انسان کے مشاہدہ سے گذرتی ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ صرف عقل رکھنے والی، سمجھنے والی اور سوچنے والی قومیں مظاہر کی اس کثرت کے پیچھے ایک واحد ارادہ شعور اور مشیت کا وجود محسوس کرتی ہیں۔ جو قومیں فہم وتفکر سے محروم ہیں وہ ان واقعات ومظاہر کو منفرد صورت میں دیکھتی ہیں۔ لیکن ان کے اندر، جو عمومی قانون کارفرما ہے، وہاں تک ان کی نظر نہیں پہنچتی ہے، اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ سکتیں کہ یہ جملہ واقعات ومظاہر اپنی کثرت اور فردیت کے باوجود ایک ہی کُل کے اجزاء ہیں۔ جس پر ایک واحد مشیّت کا قانون حکمران ہے، تو وہ خدا کی ہستی کے اعتراف پر مجبور ہوتیں اور ان میں اس قانون

مشیت کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا جس کے مطابق کائنات کے یہ واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ اس عدم تفکر اور فقدان عقل کا نتیجہ ہے۔ کہ مشرک قومیں ہر انفرادی مظہر کائنات کے سامنے سر جھکانے کو تیار ہیں۔ لیکن اس قانون کے سامنے سرافگندہ نہیں ہو سکتی ہیں۔ جو ان سب پر مافوق اور حکمران ہے۔ نتیجہ یہ ہے، کہ وہ تسخیر فطرت سے عاجز اور قدرتی واقعات و حوادث کے رحم وکرم پر جی رہی ہیں۔ اس کے برخلاف ایک عقل رکھنے والی قوم جو ان نشانیوں پر غور کر کے اس عمومی قانون کو پالتی ہیں، جس کی طرف یہ اشارہ کرتی ہیں، اس کے دل سے مظاہر فطرت کی ہیبت نکل جاتی ہے، اور اس میں کائنات کے عمومی قانون یا بالفاظ دیگر مشیت الٰہی کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک کافر قوم اپنی بے عقلی کی وجہ سے تسخیر فطرت کی قابلیت نہیں پیدا کر سکتی ہے بلکہ فطرت کی غلام رہتی ہے۔ اس کے برخلاف ایک عاقل اور مومن قوم قانون فطرت اور مشیت الٰہی کی اطاعت کر کے اپنے فطری ماحول اور قدرتی حوادث پر قابو پالیتی ہے، قرآن بار بار اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ خارجی فطرت کے مظاہر و حوادث اپنی کوئی ذاتی قوت نہیں رکھتے ہیں۔ جیسا کہ کفار اور مشرکین سمجھتے ہیں، بلکہ اگر ان کے عمومی قوانین دریافت کر لئے جائیں۔ تو ان سے انسان اپنے اغراض پورے کر سکتا ہے۔ اور اپنے مقاصد کے لئے ان سے خدمت لے سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں تمہارے لئے مسخر کر دی گئی ہیں اس لئے ان سے خوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللّٰہ الذی خلق السموات والارض وانزل من السماء ماءً فاخرج به من الثمرات رزقاً لکم و سخر لکم الفلک لتجری فی البحر و سخر لکم الانہار و سخر لکم الشمس والقمر و سخر لکم اللیل والنہار۔ اللہ ہی ہے جس نے زمین و آسمان پیدا کئے اور آسمان سے

پانی نازل کیا، پھر اس سے پھل پیدا کئے۔ جس میں تمہارے لئے رزق ہے پھر اس نے تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کیا، تاکہ وہ سمندر میں جاری ہوں پھر تمہارے لئے اس نے نہروں کو مسخر کیا، پھر اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند اور دن اور رات کی تسخیر کی) وسخر لکم اللیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ۔ ان فی ذالک لآیات لقوم یعقلون (اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ یہ سب چیزیں اس کے احکام کی پابند ہیں۔ بلا شبہ اس میں عقل رکھنے والے گروہوں کے لئے نشانیاں ہیں) یہ آیات کیا ہیں جن کی طرف قرآن بار بار اشارہ کرتا ہے۔ یہی کہ مظاہر و واقعات کے پس پشت خدا کی مشیت کا واحد قانون کام کر رہا ہے اور انسان اس قانون کو سمجھ لے اور اس کے مطابق اپنی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی تشکیل کر سکے تو اپنے طبعی اور معاشرتی ماحول پر قابو حاصل کر سکتا ہے اور دنیا و عقبیٰ کی سعادتوں سے سرفراز ہو سکتا ہے، قرآن کے نظریہ کی رو سے خدا کی مشیت جس قانون کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہے اس کو سمجھ لینے سے انسان کائنات خارجی کی تسخیر پر قدرت حاصل کر سکتا ہے اور قوائے فطرت کو اپنا خادم اور غلام بنا سکتا ہے۔ لیکن اس قانون سے عدم واقفیت کی صورت میں وہ قدرتی اور طبعی حوادث کا شکار ہو سکتا ہے چنانچہ آیات فطرت کے فہم کی دعوت دینے سے اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان عالم طبعی کے دائرہ میں مشیت الٰہی کے قانون کو سمجھ کر اپنے طبعی ماحول کی تسخیر کرے اور فطرت کی کورانہ قوتوں کے رحم و کرم پر زندگی نہ بسر کرے، لیکن قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا کی مشیت کا قانون ایک اور دائرہ میں بھی برسر عمل ہے۔ یہ دائرہ انسان کے نفس اجتماعی یعنی اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی سے متعلق ہے۔ اس دائرہ میں مشیت الٰہی جس انداز سے کارفرما ہے۔ اسے سمجھانے کے

لئے بھی قرآن آیات ہی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ اَوَلَمْ یَھدِ لَھُم
کم اھلکنا من قبلھم من القرون یمشون فی مساکنھم ان فی ذالک
لاٰیٰۃ لقوم یسمعون (کیا انہوں نے دیکھا کہ ان سے قبل کتنی امتیں ہلاک ہوگئیں
جو اپنے مساکن میں چلتی پھرتی تھیں بے شک اس میں سننے والی قوم کے لئے ایک
نشانی ہے) اس طرح قرآن آیات فطرت پر غور وفکر کی دعوت کے ساتھ اس امر کی بھی
دعوت دیتا ہے کہ ہم آیات تاریخ پر غور کریں۔ یعنی عالم تاریخ کے واقعات وانقلابات
اور قوموں کے عروج وزوال میں مشیت الٰہی کا جو قانون کار فرما ہے اور جس کے مطابق
انسانی اعمال کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں، اسے سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی
اجتماعی سیرت کی تشکیل کریں، کیونکہ قومیں جس طرح عالم فطرت کی تسخیر نہ کرسکنے
کے باعث قدرتی حوادث کا شکار ہوکر تباہ ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح اپنے معاشرتی
اور تمدنی اعمال کے نتائج اور اس قانون کو نہ سمجھنے کے باعث بھی قعر مذلت میں
گر سکتی ہیں۔ جس کے مطابق یہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے
اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم
کانوا اشد منھم قوۃ (کیا وہ زمین پر نہیں پھرے، کہ ان لوگوں کا انجام دیکھیں، جو
ان سے قبل گزر چکے ہیں۔ اور ان سے زیادہ طاقت ور تھے) قل سیروا فی
الارض۔ فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم کان
اکثرھم مشرکین (کہو کہ زمین پر چلو پھرو۔ پھر دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ جو ان سے
قبل گزر چکے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مشرک تھے) اولم یھد لھم کم اھلکنا
من القرون یمشون فی مساکنھم ان فی ذالک لاٰیات لقوم
یسمعون ۔ (کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کس طرح قوموں کو ہلاک
کیا جو اپنے مساکن میں چلتی پھرتی ہیں، اس بات میں اس گروہ کے لئے نشانیاں

ہیں۔جو سننے والا ہو) مختصر یہ کہ عالم تاریخ اور اجتماعی زندگی میں خدا کی مشیت کا جو
قانون کارفرما ہے۔اس کو سمجھانے کے لئے قرآن نے بہت سی قدیم اقوام کا تذکرہ
کیا ہے، جن کی بربادی محض اس لئے عمل میں آئی کہ وہ حیات اجتماعی کے کسی
قانون کو نہیں مانتے تھے۔بلکہ زندگی کو محض لہو ولعب سمجھتے تھے اور اس میں کسی
سنجیدہ مقصد کے قائل نہ تھے اس ناآشنائی قانون اور طفلانہ لذت پرستی سے
انسان کو روکنے کے لئے اولاً قرآن کائنات اور زندگی کی مقصدیت کو واضح
کرتا ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عبثاً وانکم الینا لا ترجعون (کیا تم
یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف واپس
آنا نہیں ہے) وما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلاً۔ ذلك ظن الذين
کفروا۔ (ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس کو بیکار نہیں
پیدا کیا ہے، یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہیں خدا کی ہستی کا انکار رہے) انا جعلنا
ما علی الارض زینة لنبلوهم ایهم احسن عملاً (ہم نے زمین پر جو کچھ زینتیں پیدا
کی ہیں، ان کی غرض صرف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے ہم انسانوں کو آزمائیں، کہ
ان میں کس کا عمل بہتر ہے) وما خلقنا السماء والارض وما بینهما لاعبین. لو
اردنا ان نتخذ لهواً لاتخذناه من لدنا ان کنا فاعلین
(اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، کھیل کود کے
طور پر نہیں پیدا کیا، اگر ہم صرف لہو ولعب کی خاطر انہیں بناتے تو اپنے پاس سے
بناتے) اس توضیح سے قرآن کا منشا یہ ہے کہ انسان اخلاقی زندگی کے قانون کو
تسلیم کرے، دنیوی لذائذ اور مسرتوں میں اتنا سرشار نہ ہو جائے کہ اسے اپنے
مقصد زندگی کی خبر نہ رہے۔اور جانوروں کی طرح کھانے پینے اور شہوانی خواہشات
کی تکمیل کو زندگی کی کل حقیقت نہ سمجھ لے، جن قوموں اور گروہوں کا نقطہ نظر زندگی

کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ وہ محض ایک کھیل تماشا ہے اور اس میں کوئی شعوری مقصد یا مشیت کارفرما نہیں ہے۔ جس سے نسبت پیدا کرنا یا جس کے قانون کی اطاعت کرنا ضروری ہو۔ ان کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے بجز خواہشات نفسانی کے کوئی اصول یا قانون باقی نہیں رہتا ہے۔ چنانچہ ایسی قومیں صرف خواہشات کے راستے پر چلتی ہیں۔ واقعات عالم کو اپنی ہوا و ہوس کی عینک سے دیکھتی ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو قانون حیات اور مشیت الٰہی کے سانچے میں ڈھالیں۔ وہ اپنے نفس کی ادنیٰ خواہشات اور اپنی ذاتی یا اجتماعی آرزوؤں کو قانون کا درجہ دے دیتی ہیں۔ اس طرح خواہشات کی غلامی میں مبتلا ہو کر ان کی فکر میں معروضیت (OBJECTIVITY) کی جگہ موضوعیت (SUBJECTIVITY) پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ حقائق اشیاء کو اپنے ہوائے نفس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں، بجائے اس کے کہ اپنی خواہشات کو حقیقت کے مطابق بدلیں۔ اسی لئے قرآن نے، خواہشات کی غلامی کو انسانی نامرادیوں اور تباہیوں کا سب سے اہم سبب قرار دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا کافروں پر ایک مسلسل اعتراض یہ ہے کہ وہ خواہش کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں۔ افرأیت من اتخذ الٰھہٗ ھواہ واضلہ اللہ علیٰ علم (کیا تم نے نہیں دیکھا اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور اللہ نے اس وجہ سے اسے گمراہ کر دیا ہے) فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیّا۔ (ان کے بعد ایسے لوگ آئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی، اور خواہشات کے پیچھے چل پڑے، پس یہ لوگ گمراہی میں ڈال دیئے جائیں گے) یاداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالعدل ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ۔ (اے داؤد، ہم نے تجھے زمین پر خلیفہ مقرر

کیا، پس لوگوں کے درمیان انصاف کر۔ اور خواہشات کے پیچھے نہ چل، اگر ایسا کیا تو خواہشات تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گی)، ان تمام آیتوں میں خواہشات کی غلامی کو قرآن نے انسان کی گمراہی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہش پرستی انسان کو خارجی حقائق کے ادراک سے باز رکھتی ہے۔ خواہش پرست افراد و اقوام عالم خارجی کے تمام واقعات کو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق توڑتے مڑوڑتے رہتے ہیں۔ ان میں اتنی صداقت پسندی نہیں ہوتی ہے کہ خارجی حالات کے ٹکراؤ سے جب ان کی غلطی کا راز فاش ہو جائے تو وہ اس انکشاف کے مطابق اپنا رویہ تبدیل کریں۔ اس کے برعکس وہ قوانین حیات کے مطابق کام کرنے کے بجائے اس قانون کو اپنی مرضی کا تابع بنانا چاہتے ہیں۔ وہ خدا کی اطاعت کرنے کے بجائے اُسے اپنا مطیع بنانا چاہتے ہیں۔ اس بنیادی غلطی کی وجہ سے ان کی فکر میں معروضیت باقی نہیں رہتی ہے اور وہ حقائق کے فہم و ادراک سے قاصر رہتے ہیں، خواہ یہ حقائق مذہبی ہوں، یا علمی، مختصر یہ کہ ہوائے نفس کے اتباع سے انسان دین و مذہب اور علم و حکمت دونوں سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مذہب کی مانند سائنس اور علم و حکمت کی ترقی کا دار و مدار بھی انسان کی صداقت پسندی پر ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کا اخلاقی احساس جو ہر شعبہ زندگی میں سچائی کا متلاشی رہتا ہے، مذہب اور علم دونوں کا واحد سہارا ہے۔ جو قومیں فطرت اور عالم تاریخ کے واقعات کا مطالعہ بے تعصبی سے نہیں کر سکتی ہیں۔ محض اس خوف سے کہ مبادا ان سے کوئی ایسا نتیجہ اخذ کرنا پڑے جو ان کے مروجہ عقائد، عادات یا طرز زندگی کے خلاف ہو یا جس سے ان کی نفس پرستانہ زندگی میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہو، ان کی تباہی اور نامرادی یقینی ہے، اس لئے قرآن نے خواہشات کی غلامی کو انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت قرار دیا ہے اور اسے

کفر و شرک کی خصوصیات میں سے شمار کیا ہے۔ اس اصولی تعلیم کے بعد قرآن اجتماعی فلاح و سعادت کے قانون کی توضیح کے سلسلہ میں ان قوموں کی زندگی سے استشہاد کرتا ہے۔ جو کائنات کو بے مقصد سمجھنے کی وجہ سے اور خواہشات نفس کی پرستش کے باعث تباہ و برباد ہوگئیں، قرآن کا یہ حصہ جس میں امم سابقہ کی بربادی اور ہلاکت کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے فلسفہ تاریخ کا نچوڑ اور اس کے تمام تفصیلی احکام وضوابط کی بنیاد ہے۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کی نظر میں کون سے معاشرتی عوامل انسانی جماعتوں کو ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا دعویٰ جو قرآن پیش کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم بلاوجہ تباہ و برباد نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمیشہ قوموں کے اجتماعی اعمال کی خرابیاں ان کی تباہی کی موجب ہوتی ہیں، ان خرابیوں کو مجموعی حیثیت سے وہ کبھی ذنوب اور کبھی ظلم کے نام سے موسوم کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔ وما کنا مھلکی القریٰ الّا و اھلھا ظلمون (ہم کسی بستی کو تباہ نہیں کرتے۔ بجز اس کے کہ اس کے بسنے والے ظالم ہوں) وکم من قریۃٍ اھلکنٰھا فجاءھا باسنا بیاتًا او ھم قائلون فما کان دعوٰھم اذ جاءھم باسنا الّا ان قالوا انّا کنّا ظٰلمین۔ (اور کتنی ہی بستیاں تھیں، جنہیں ہم نے تباہ کر دیا اور جن پر ہمارا عذاب اس حالت میں آیا کہ اس کے باشندے رات کی تاریکی میں تھے یا دوپہر کو سو رہے تھے) کدأب آل فرعون والذین من قبلھم کذّبوا بآیات ربّھم فاھلکنٰھم بذنوبھم واغرقنا آل فرعون وکلٌّ کانوا ظٰلمین (آل فرعون اور ان سے پہلوں کی طرح کہ انہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا، پس ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے، انہیں ہلاک کر دیا اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا، اور وہ سارے کے سارے ظالم تھے) ذٰلک من انباء القریٰ نقصّہ علیک منھا

قائم وحصید۔ وما ظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون (یہ آبادیوں کی تاریخ ہے، جس کا حال ہم تم سے بیان کرتے ہیں، ان میں سے بعض قائم ہیں اور بعض تباہ ہو چکی ہیں۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرتے تھے) وکم قصمنا من قریۃٍ کانت ظالمۃً وانشانا من بعدھا قوماً آخرین (اور کتنی ہی بستیاں ہم نے پیس ڈالیں اور اس کے بعد ہم نے دوسری قوموں کو کھڑا کیا) اولم یسیروا فی الارض فینظر وکیف کان عاقبۃ الذین کانوا من قبلھم کانوا ھم اشدّ منہم قوۃً وآثاراً فی الارض فاخذھم اللہ بذنوبھم وما کان لھم من اللہ واق۔ (کیا تم زمین پر نہیں چلے کہ ان لوگوں کا حشر دیکھتے، جو ان سے پہلے اور ان سے زیادہ قوت رکھنے والے تھے۔ اللہ نے ان کے گناہوں کی سزا دی اور اللہ سے ان کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا) پھر قرآن ان اقوام کی تباہی میں اتراف یعنی عیش پرستی کی عادت کو سب سے بڑا سبب قرار دیتا ہے، اسی طرح قرآن نے تباہ ہونے والی قوموں کی ایک اور خصوصیت بیان کی ہے کہ ان میں کثرت مال و اولاد کا غرور پیدا ہو جاتا ہے، یعنی وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کی معاشی برتری اور کثرت آبادی انہیں ہر اجتماعی آفت و مصیبت سے محفوظ کر دے گی اور ان کا اقتدار دوسری قوموں پر محض اس لئے قائم رہے گا کہ یہ معاشی حیثیت سے طاقتور اور تعداد کے لحاظ سے برتر ہیں۔ قرآن کا مقصد ایسی متکبر اقوام کو یہ بتانا ہے کہ معاشی تفوق یا کثرت آبادی اجتماعی فلاح کے تنہا عوامل میں سے نہیں ہیں بلکہ کچھ اور عوامل بھی ہیں۔ جن کے ساتھ مل جل کر معاشی ترقی اور کثرت تعداد کام آسکتی ہے، مگر جن سے الگ ہو کر یہ دونوں عوامل بیکار ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے۔ واذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففسقو فیھا فحق علیھا القول فدمرنا ھا تدمیراً (اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس کے عیش پرست اور خوشحال

لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پس وہ جی بھر فسق وفجور کرتے ہیں، پھر ان پر ہمارا قول پورا ہو جاتا ہے۔ پس ہم ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں) بل قلوبھم فی غمرۃ من ھذا ولھم اعمال من دون ذالک ھم لھا عاملون حتی اذا اخذنا مترفیھم بالعذاب اذا ھم یجئرون، (ان کے دل اس طرف سے بے ہوش ہیں اور ان کے سوا دوسرے کام ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان کے خوش حال لوگوں کو ہمارے عذاب نے آلیا تو وہ چیخنے چلانے لگے) وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا فتلک مساکنھم لم تسکن من بعدھم الا قلیلا (اور ہم نے کتنی ہی بستیاں تباہ کر ڈالیں جنہیں اپنی خوشحالی کا غرور تھا، یہی ان کا مسکن تھا جس میں ان کے بعد بہت کم لوگ رہ گئے) وقالوا نحن اکثر اموالا واولادا وما نحن بمعذبین (انہوں نے کہا کہ ہم مال اور دولت کی کثرت سے بہرہ ور ہیں اس لئے ہم پر عذاب نہیں آئے گا) وکذالک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا علی آثارھم مقتدون (اسی طرح ہم نے تجھ سے قبل کسی بستی میں کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کے عیش پرست اور خوش حال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباواجداد کو ایک طریقہ پر چلتا ہوا پایا اور ہم انہیں کے نشان ہدایت پر چلیں گے) وکم قصمنا من قریۃ کانت ظالمۃ وانشأنا من بعدھا قوما آخرین۔ فلما احسوا باسنا اذا ھم منھا یرکضون۔ لا ترکضوا وارجعوا الی ما اترفتم فیہ ومساکنکم لعلکم تسئلون (اور کتنی ہی بستیاں ہم نے پیس ڈالیں اور اس کے بعد دوسری قوموں کو ان کی جگہ کھڑا کیا۔ پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو وہ وہاں سے ایڑ کرنے لگے ایڑ مت کرو، اور لوٹ جاؤ۔ جہاں تم نے عیش کیا تھا اور اپنے گھروں میں شاید تم کو کوئی پوچھے) ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن قوموں پر تباہی آنے والی ہوتی ہے

ان میں مال و دولت کی کثرت یا ایک محدود طبقہ کے بہت زیادہ مال دار ہو جانے کی وجہ سے عیش و عشرت کی عادات پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کے بڑے بڑے لوگ اپنی خوشحالی کے زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ احادیث نبوی میں بھی کثرت اموال کو قوموں کی ہلاکت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ کو بحرین کا جزیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جب وہ جزیہ لے کر مدینہ آئے اور انصار کو یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ صبح کی نماز کے بعد گھروں کو واپس جانے کے بجائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ان کا عندیہ سمجھ لیا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ میں جانتا ہوں تم کس لئے رک گئے ہو۔ پھر آپؐ نے کہا کہ مجھے یہ خطرہ نہیں ہے کہ تم فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاؤ گے بلکہ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا کی خوشحالی فراخ نہ ہو جائے اور تم بھی ان قوموں کی طرح تباہ ہو جاؤ جن پر مال و دولت کی فراوانی کے باعث تباہی آئی۔ قوم نوح کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے زوال پذیر قوموں کی ایک اہم خصوصیت بتاتی ہے کہ ان کے حکمرانوں، لیڈروں اور امراء کا ایک مخصوص طبقہ پیدا ہو جاتا ہے، جو اپنی قوم کی اکثریت کو ذلیل سمجھتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف ان کی قوم کے سرداروں اور مالدار اشخاص کا ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان کے پیرو وہ لوگ ہیں جن کا شمار قوم کے پست اور ذلیل طبقات میں ہوتا ہے۔ فقال الملاء الذین کفروا من قومہ ما نرٰک الا بشراً مثلنا وما نرٰک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای (نوح کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے یہ دلیل پیش کی، کہ ہم تجھے اپنے ہی جیسا ایک انسان پاتے ہیں اور ہم دیکھتے کہ تیرے ماننے والے وہی لوگ ہیں جو ہم میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار اور پست ہیں) یہ عجیب و غریب استدلال، کہ چوں کہ تمہارے ماننے والے کم حیثیت ہیں۔ اس لئے تم حق پر نہیں

ہو سکتے ہو۔ صرف اسی طبقہ کی طرف سے پیش کیا جا سکتا ہے، جس کی نظر میں حق و باطل کا معیار دنیوی عزت و سربلندی اور خوشحالی ہوتی ہے نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے افراد کی اکثریت کو حقارت و تذلیل کی نظر سے دیکھتے تھے، جدید اصطلاح میں ہم اس پست طبقہ کے افراد کو جو حضرت نوح کے ساتھ تھے پرولتاریہ (PROLETARIAT) کہہ سکتے ہیں یعنی ایک ایسا طبقہ جو محروم الملک (PROPORTYLESS) ہو، قوم مدین کی تباہی کا جہاں ذکر آیا ہے، وہاں زوال پذیر اقوام کی ایک اور صفت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی قوم کے افراد مال و دولت کے استعمال پر کسی پابندی کو قبول نہیں کرتے ہیں یعنی وہ اس بات کے قائل نہیں ہوتے ہیں کہ مالدار افراد پر قوم کے غریب اور نادار اشخاص کا کوئی حق ہے۔ چنانچہ حضرت شعیب کے خلاف اہل مدین کا ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ مال و دولت کے خرچ و استعمال پر پابندیاں لگاتے ہیں قالوا یا شعیب اصلوتک تامرک ان نترک مایعبد آباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشؤا (انہوں نے کہا اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہم ان خداؤں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف کرتے تھے اور یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کے استعمال میں آزاد نہ رہیں)، جدید اصطلاح میں یہ لوگ آزاد انفرادی معیشت (ECONOMIC INDIVIDUALISM) کے قائل تھے اور تحدید ملکیت (LIMITATION OF PROPERTY) کو ایک گناہ سمجھتے تھے، انحطاط پذیر قوموں کے ان خصائص اور صفات کے علاوہ قرآن ہمیں قوموں کے اسباب شکست اور موجبات ہلاکت کا ایک عمومی قانون بھی بتاتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے وضرب اللہ مثلاً قریۃً کانت آمنۃ مطمئنۃً یاتیھا رزقھا رغداً من کلِ مکانٍ فکفرت بانعم اللہ فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون

اللہ تمہیں ایک بستی کی مثال دیتا ہے جس میں امن و اطمینان کا دَور دورہ تھا اور جس میں ہر چہار سو رزق کی فراوانی تھی، پھر اس بستی والوں نے اللہ کی نعمتوں کا غلط استعمال کیا تو اللہ نے اس کو بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا۔ یہ ان گناہوں کی پاداش تھی جن کا وہ ارتکاب کرتے تھے) اس آیت میں خداوند تعالیٰ اپنی نعمتوں کے غلط استعمال کو تباہی کا سبب قرار دیتا ہے، جس کی سزا قوموں کو یہ ملتی ہے کہ وہ بھوک اور خوف میں مبتلا ہو جاتی ہیں یعنی ان کے جان و مال کی حفاظت اور امن و امان کی اطمینانی کیفیت باقی نہیں رہتی ہے، اور ان کے معاشی وسائل رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں، موجودہ طرز بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی سزا (INSECURITY OF LIFE AND PROPERTY) کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ قدرت کی نعمتوں کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ اب سوال یہ ہے، کہ وہ نعمتیں کیا ہیں۔ اور اُن کا غلط استعمال کس طور سے عمل میں آتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی نعمتیں ویسے تو بے شمار ہیں۔ لیکن دولت، حکومت، جسمانی قوت اور علم وبصیرت اس کی خاص نعمتیں ہیں، انہیں چار نعمتوں کے غلط استعمال سے قومیں تباہ ہوتی ہیں دولت کا غلط استعمال یہ ہے کہ انسان اسے اپنی راحت طلبی اور تن پروری پر صرف کرے اور اس میں سے معاشرہ کے کمزور افراد کو اُن کا حق نہ دے۔ حکومت کا غلط استعمال یہ ہے کہ اسے صرف شخصی یا طبقاتی جاہ و ثروت کا ذریعہ بنا لیا جائے اور بندگان خدا کی نفع رسانی یا ملک کی خدمت کا کوئی جذبہ کارکنان حکومت میں باقی نہ رہے جسمانی قوت کا غلط استعمال یہ ہے کہ اس سے لذت پروری اور عیش پرستی کا کام لیا جائے۔ ذہنی قوتوں کے غلط استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ وہ محض شہرت نام و نمود اور حصول اقتدار کا وسیلہ بن کر رہ جائے۔ اس طرح جو قومیں دولت کے ذریعہ عیش پرستی، حکومت کے ذریعہ استحصال اور جاہ پرستی، جسمانی قوت کے ذریعہ

لذت طلبی اور ذہنی طاقتوں کے ذریعہ سیاسی مکر و فریب کی عادی ہو جاتیں قرآن کے نزدیک ان کی تباہی یقینی ہے۔

اسلام کی بُنیادی تعلیمات

قوموں کی فلاح و سعادت اور فساد و ہلاکت کے بارہ میں قرآن نے جو نظریہ پیش کیا ہے اسی کی روشنی میں وہ اپنی ابدی تعلیمات مرتب کرتا ہے اور مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے چند بُنیادی اصول وضع کرتا ہے جن پر ہر زمانہ، ہر دور اور ماحول میں اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہونی چاہیئے۔ زمانی اور مکانی تبدیلیوں کے باعث وہ صورتیں بدل سکتی ہیں جن میں ان اصولوں کا اطلاق عمل میں آتا ہے۔ لیکن یہ اصول اپنی جگہ اٹل اور دائمی رہیں گے۔ اس لئے اسلام میں جو امور بنیادی حیثیت رکھتے اور جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے وہ یہی بنیادی اور اساسی اصول و کلیات ہیں جن کا تعلق معاشی زندگی سے بھی ہے، سیاسیات سے بھی ہے نیز قانون اور معاشرت سے بھی ہے۔

معاشی زندگی کے اصول

اجتماعی زندگی کے اسباب فساد و ہلاکت کے بارے میں قرآن نے جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور جس کی وضاحت گذشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے۔ اس سے قرآن کے معاشی نظریہ پر بہت گہری روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں معاشی امور کے متعلق اتنی تفصیلی ہدایات موجود ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے اسلام کے معاشی اصولوں کو منضبط کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آسکتی ہے۔ قرآن کی معاشی تعلیمات اپنی روح اور مزاج میں سرمایہ دارانہ طرز معیشت کی قطعی ضد ہیں۔ اگرچہ اسلام نے جائز حدود کے اندر انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور مملکت کو معاشی وسائل پر ویسا کامل اقتدار نہیں عطا کیا ہے جیسا کہ اشتراکیت

نے، پھر بھی وہ سرمایہ پرستی، نفع اندوزی اور ان تمام معاشی اصولوں کا شدت سے مخالف ہے، جو آج کل کے سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام استحصال ناجائز اور غریب و امیر کے فرق کو مٹانا چاہتا ہے۔ درآں حالیکہ سرمایہ داری انہیں دونوں لوازم پر زندہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلا معاشی مسئلہ اس وقت پیش آیا۔ جب کہ مدینہ میں پہنچنے کے بعد بدر کی لڑائی ہوئی اور مسلمانوں کو کفار سے مال غنیمت حاصل ہوا۔ اسلام سے پہلے یہ قاعدہ تھا کہ مال غنیمت فوجیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ کیونکہ غنیمت کے متعلق تصور یہ تھا کہ اُسے اہل فوج اپنے دست و بازو سے حاصل کرتے ہیں۔ جس پر غیر فوجیوں کا حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے، اسلام کے بعد بھی یہ قاعدہ بلا کسی تغیر کے جاری رہا۔ مگر اسلام نے مال غنیمت میں بھی، جس کے حصول میں فوجیوں کے علاوہ دیگر افراد معاشرہ کی جد و جہد کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ پانچواں حصہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے مختص کر دیا۔ چنانچہ قرآن میں مال غنیمت کے متعلق ارشاد ہے۔ واعلموا انّما غنمتم من شیٍٔ فانّ للّٰہ خمسہ وللرسول ولذی القربٰی والیتامٰی والمساکین وابن السبیل (اور جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تمہیں ہاتھ آئے تو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے اور رسول کے لئے ہے اور ذوی القربٰی کے لئے اور یتامٰی کے لئے اور مساکین اور مسافروں کے لئے)۔ اس طرح اس اولین معاشی مسئلہ کے تصفیہ میں اسلام نے اپنا معاشی مزاج و میلان ظاہر کر دیا، یعنی وہ مال و دولت میں غیر محدود ذاتی ملکیت کے حق کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ خواہ مال کسی ذریعہ سے حاصل کیا جائے۔ اس میں بہر حال دیگر افراد معاشرہ کا حق شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے یہ بھی وضاحت کر دی کہ وہ ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا نہیں چاہتا ہے جس میں دولت کی ایک بڑی مقدار چند مخصوص افراد یا طبقات میں مجتمع ہو جائے۔ ما افاء اللہ

علیٰ رسولہ من اھل القریٰ فللّٰہ و للرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین کے لایکون دولۃً بین الاغنیاء منکم (جو کچھ اللہ اپنے رسول کو بستی والوں سے دلوادے، تو وہ اللہ کے لیئے ہے اور رسول کے لیئے اور قریبی رشتہ داروں کے لیئے اور یتیموں اور مسکینوں کے لیئے تاکہ وہ صرف تمہارے مالدار افراد کے درمیان گردش نہ کرے)، اس آیت کا آخری ٹکڑا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ طرز معیشت کا شدید ترین مخالف ہے۔ کیونکہ وہ دولت کی گردش کو صرف امراء کے ایک مختصر طبقہ تک محدود کرنا نہیں چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس نے فیٔ یعنی اُن اموال میں جو زکواۃ، خراج اور جزیہ کے علاوہ حکومت کو وصول ہوں، معاشرہ کے کمزور اور نادار افراد کا ایک حصہ الگ کر لیا ہے، درحقیقت اسلام کسی مسلمان کے مال کو اس وقت تک پاک نہیں قرار دیتا ہے، جب تک کہ وہ اس میں سے کمزوروں معذوروں، بیواؤں اور یتیموں کا حق نہ ادا کرے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے۔ خذ من اموالھم صدقۃً تطھرھم وتزکیھم بھا۔ (مسلمانوں کے اموال میں صدقہ لو۔ اس طرح سے تم انہیں پاک کر دو گے) یعنی اموال کی پاکیزگی کے لیئے یہ ضروری ہے کہ اس میں سے معاشرہ کے کم یاب اور معذور افراد کا حق ادا کیا جائے، پھر یہ حکم علی الاطلاق دیا گیا ہے، اور اس میں کوئی قید یا شرط نہیں رکھی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کو، اجتماعی سود و بہبود اور یتیموں بیواؤں، معذوروں اور بیکار افراد معاشرہ کی مالی امداد کے لیئے جس قدر رقم کی ضرورت ہو۔ وہ مالداروں سے وصول کر سکتی ہے لیکن یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ ایک محدود طبقہ کی معاشی آزادی کی خاطر ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو معاشی حیثیت سے کمزور رہنے دیا جائے یا انہیں فقر و فاقہ کی زندگی گزارنے کے لیئے چھوڑ دیا جائے نظام سرمایہ داری، افراد کی معاشی آزادی کے ایک غلط فلسفہ کی بنا پر بے شمار

انسانوں کو بھوک اور تکلیف میں مبتلا کر دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا ہے۔ اس لئے اسلام اور سرمایہ داری میں کبھی مصالحت نہیں ہو سکتی ہے۔ پھر قرآن نے دولت کے جمع کرنے اور اسے کمزوروں اور غریبوں کی امداد پر صرف نہ کرنے کی جتنی پُرزور مذمت کی ہے اس سے بھی سرمایہ داری کے بنیادی اصول یعنی ارتکاز (ACCUMULATION OF WEALTH) پر ضرب لگتی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم، (جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں۔ انہیں سخت عذاب کی خبر دو) اس سے معلوم ہوا۔ کہ قرآن ارتکاز مال کا مخالف ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ لوگ اپنا زائد مال اجتماعی اور معاشرتی اغراض کے لئے صرف کریں، چونکہ نظام سرمایہ داری میں دولت کے صرف کرنے کے بجائے دولت بچانے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور انہیں لوگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو اپنے جمع کردہ اموال کو پیدا آور قوتوں (PRODUCTIVE POWERS) میں توسیع و اضافہ کی غرض سے صرف کرتے اس لئے یہ نظام معیشت روح اسلام کے منافی ہے، کیونکہ قرآن کا منشا یہ ہے، کہ اگر دولت کا ایک حصہ پیدا آور قوتوں پر صرف کیا جائے تو کم از کم ایک مساوی حصہ قوت خرید (PURCHASING POWER) اور قوت صرف (POWER OF CONSUMPTION) میں اضافہ کے لئے استعمال کیا جائے۔ کیونکہ جس معاشرہ میں عام غربت و افلاس کی وجہ سے اجتماعی قوت خرید کمزور ہو جاتے۔ اس میں محض پیدا آور قوتوں کے اضافہ سے فارغ البالی اور خوشحالی نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ نظام سرمایہ داری کو اس سے بحث نہیں ہے کہ قوت پیدا آور کے اضافہ کے باعث اشیاء کی فراوانی سے کیا نتیجہ پیدا ہوگا۔ اگر لوگوں کی قوت خرید میں کمی کے باعث ان اشیاء کے

فروخت کا انتظام نہ ہو سکا، حالانکہ پیداوار کی کثرت اسی وقت معاشرہ کے لئے مفید ہو سکتی ہے، جب قوت خرید میں مساوی اضافہ ہوتا رہے اور پیداوار کی نسبت سے طلب بھی بڑھتی رہے۔ سرمایہ داری کی شکست اور تباہی کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس نے پیداآور قوتوں اور عوام الناس کی قوت خرید میں کوئی توازن قائم نہیں رکھا جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ معاشرہ کی پیداآور قوتیں انتہا سے زیادہ بڑھ گئیں۔ مگر چونکہ اس کے ساتھ معاشرہ کی قوت خرید میں کوئی اضافہ نہیں ہؤا یا ہؤا تو پیداآور قوتوں کی نسبت سے بہت کم، اس لئے مجموعی حیثیت سے رسد اور طلب میں مساوات قائم نہیں رہی اور اشیاء کی ایک کثیر مقدار ناقابل فروخت ہو گئی۔ طلب اور رسد میں اس عدم توازن کا ایک اثر یہ ہوا کہ سرمایہ داروں کو بیرونی ممالک میں نئی منڈیاں تلاش کرنی پڑیں، اور اس کے لئے انہوں نے سیاسی مکر و فریب اور فوجی قوت کا استعمال کیا جس نے امپریلزم یا استعماریت کی تخلیق کی، لیکن جب قوت پیداآور میں غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے نو آبادیات بھی زائد از ضرورت اشیاء اور مصنوعات کو جذب نہ کر سکیں۔ تو قیمتوں کو برقرار رکھنے کے لئے سرمایہ داروں نے ان اشیاء کو ضائع کر دینا بہتر خیال کیا، حالانکہ اگر پیداآور قوتوں کے ساتھ معاشرہ کے عام افراد کی قوت صرف اور قوت خرید بھی بڑھ جاتی تو یہ صورت کبھی پیش نہ آتی۔ اس طرح جس طرز معیشت میں پیداآور قوتوں اور قوت صرف دونوں میں بیک وقت اور یکساں ترقی عمل میں نہیں آئے گی۔ اس کی تباہی ضروری اور ناگزیر ہے۔ اسلام نے دولت جمع کرنے اور اسے بیواؤں، یتیموں معذوروں اور نادار افراد پر صرف نہ کرنے کی جو شدید مذمت کی اس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کی اجتماعی قوت خرید میں کمی نہ ہو، زندگی کے اور شعبوں کی طرح وہ پیداآور قوتوں اور صرف کی قوتوں میں توازن اعتدال اور مصالحت پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ معاشی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں میں کسی ایک

پر اتنا زیادہ زور دیا جائے، جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ معاشرہ کی قوت صرف اور قوت خرید میں اضافہ کرنے کی غرض سے اسلام نے نظام زکوٰۃ جاری کیا۔ جس کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کی اجتماعی دولت کا ایک حصہ اس غرض کے لئے مختص کر دیا جائے کہ اس سے آمدنیوں کی از سر نو تقسیم عمل میں آئے تاکہ زیادہ آمدنی رکھنے والے اشخاص کی آمدنی کو کم اور کم آمدنی رکھنے والے افراد کو زیادہ کیا جا سکے۔ علاوہ اس فائدہ کے زکوٰۃ کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اسلام مالدار افراد کی دولت میں محروموں اور ناداروں کا حق تسلیم کرواتا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے وفی اموالھم حقٌ للسائل والمحروم، اس حق کو اسلام نے صرف نظری حیثیت سے تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ اسے ایک باقاعدہ اور منظم نظام کی صورت دے دی، جس کے تحت اسلامی حکومت مالدار سے اس معاشرتی حق کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اُسے بزور قوت وصول کر سکتی ہے۔ حکومت کو جو آمدنی اس طرح وصول ہوتی ہے اُسے مفاد عامہ یعنی ان مصارف میں نہیں لگایا جا سکتا ہے، جن سے غریب اور امیر دونوں کو یکساں فائدہ ہو۔ مثلاً زکوٰۃ کی رقم کو سڑکوں، پلوں یا باغوں کی تیاری، دفاتر کی تعمیر یا جہازوں اور ریلوں کی صنعت پر نہیں صرف کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں غریب و امیر سب کا فائدہ ہے۔ بلکہ امیر کو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ زکوٰۃ براہ راست ان افراد کی معاشی امداد پر صرف کی جاتی تھی۔ جو اپنے حالات یا مجبوریوں سے مستحق امداد ہوں اس کی نوعیت آج کل کے نظام تحفظ معاشری (SOCIAL. SECURITY - SYSTEM) کی تھی۔ جس کے تحت بیکاروں، بیواؤں، یتیموں اور معذوروں کو حکومت کی جانب سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آج کل کے جدید ترقی یافتہ ممالک میں جو چیز پورے طور پر نافذ نہیں ہو سکی۔ اسلام نے اسے آج سے تیرہ سو برس پہلے نافذ کر دیا تھا۔ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ کہ آج کل حکومت

مال داروں سے زکوٰۃ کی بہ نسبت بہت زیادہ محصولات وصول کرتی ہے، اس لئے اب زکوٰۃ کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ جو محصولات مالدار افراد سے وصول کئے جاتے ہیں۔ ان کی آمدنی زیادہ تر، پھر انہیں متمول افراد و طبقات کو کسی نہ کسی شکل میں واپس کر دی جاتی ہے۔ حکومت پر ان محصولات کے صَرف کرنے کی بابت کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف زکوٰۃ کی رقم سے جو آمدنی ہوتی ہے، اس کے لئے حکومت پابند ہے کہ وہ انہیں صرف ایسے افراد معاشرہ پر صَرف کرے، جو معاشی مسابقت میں پیچھے رہ گئے ہوں۔ یا اتفاقی حوادث اور عمر کے تقاضہ سے مجبور ہوکر اپنی معاش خود نہ حاصل کر سکتے ہوں، البتہ موجودہ زمانہ کے تبدیل شدہ حالات و مصالح کے لحاظ سے زکوٰۃ کی تفصیلات میں اجتہاد کی گنجائش ہے کیونکہ اس زمانہ میں بہت سے ایسے طبقات ناپید ہو گئے ہیں جو پہلے زکوٰۃ کے مستحق قرار دیئے جاتے تھے۔ مثلاً مولفۃ القلوب اور رقاب یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے اب زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جا سکتی ہے، اسی طرح جو اشیاء قابل زکوٰۃ قرار دی گئی تھیں ان میں بھی بہت کچھ ردّ و بدل کی گنجائش ہے۔ نیز زکوٰۃ کے نصاب میں بھی بلحاظ حالات تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نظام زکوٰۃ کا قیام اسلام کا منتہاء مقصود نہیں ہے، درحقیقت اسلام عدل معاشری کے لئے اس منزل سے بہت آگے آگے جانا چاہتا ہے۔ جس پر معاصرانہ زندگی کے حالات نے اُسے ٹھہرنے پر مجبور کر دیا تھا اس لحاظ سے وہ ایک اعلیٰ درجہ کا ارتقائی مذہب ہے۔ جو تغیر احوال اور زمانہ کی تبدیلیوں کا پورا پورا لحاظ کرتا ہے۔

جہاں تک اجتماعی ملکیت کا سوال ہے، قرآن سے نہ ہمیں اس کی تائید ملتی ہے اور نہ تردید۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن جس عہد میں نازل ہوا تھا۔ اس زمانہ میں وسائل حیات کی تنظیم اور مملکت کی طاقت و اختیار کا دائرہ بہت محدود تھا۔ ایسے حالات میں

کسی حکومت کے لئے بڑے پیمانہ پر معاشی زندگی کی تنظیم کا کام انجام دینا ممکن نہ تھا اس لئے اگر اسلام اجتماعی ملکیت کی تائید بھی کرتا تو عملاً اس کا نفاذ ناممکن ہوتا۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس بارے میں سکوت اختیار کیا۔ لیکن بعض احادیث اور فقہا کے اقوال سے ہمیں اجتماعی ملکیت کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً ترمذی کی ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ابیض بن حمال نامی ایک صحابی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مآرب (یمن)، کا ایک کھارا چشمہ بطور جاگیر عطا فرمایا۔ لیکن جب وہ اپنی جاگیر کی سند لے کر روانہ ہوئے، تو لوگوں نے عرض کیا کہ حضور نے جو چشمہ ابیض بن حمال کو عطا کیا ہے۔ وہ ایک چشمہ جاریہ ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اگر وہ ایسا چشمہ ہے تو اسے جاگیر میں نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن اشیاء کا تعلق عام لوگوں کی ضروریات سے ہو اور جن پر انفرادی ملکیت قائم ہو جانے سے عوام کی ضروریات کی تکمیل میں حرج واقع ہونے کا احتمال ہو۔ انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" میں علامہ ابن قدامہ کے حوالے سے نمک، گندھک، مومیائی مٹی کا تیل، سرمہ، یاقوت اور بعض دیگر ظاہری معادن پر جن تک بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی حاصل ہو سکے، اجتماعی ملکیت جائز قرار دی ہے۔ علامہ ابن قدامہ ان اشیاء کے متعلق لکھتے ہیں۔ لا تملك بالاحياء ولا يجوز اقطاعها لاحد من الناس ولا احتجاره دون المسلمون لان فيه ضرراً بالمسلمين وتضييقاً عليهم نہ آباد کرنے اور نہ حکومت سے جاگیر ملنے کی وجہ سے ان اشیاء کا کوئی مالک ہو سکتا ہے، اور نہ یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں پر اس سے استفادہ کی راہ بند کی جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور ان پر تنگی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اجتماعی ملکیت کی گنجائش موجود ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف

ہوسکتا ہے کہ اجتماعی ملکیت کے حدود کیا ہونے چاہئیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی احکام کی رو سے اجتماعی ملکیت کا دائرہ اتنا وسیع بھی نہ ہونا چاہیئے کہ ملکیت اور سرمایہ کی آزادی بالکل معدوم ہو جائے۔ اور لوگ معاشی حیثیت سے مملکت کے بالکل دست نگر ہو جائیں۔ لیکن انفرادی ملکیت کے حق کو قائم رکھتے ہوئے اس کے دائرہ کو بلحاظ حالات و مصالح محدود کر دینے میں اسلامی احکام کی رُو سے قطعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

سیاسی زندگی کے بارے میں اسلامی زاویہ نگاہ،

سیاسی دائرہ میں قرآن کی تعلیمات مجمل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سیاسی امور کو حالات کا تابع قرار دیتا ہے اور کوئی ایسا تفصیلی یا مکمل سیاسی نظام وضع کرنا نہیں چاہتا ہے۔ جس سے آیندہ کے لئے سیاسی ارتقاء کی راہ مسدود ہو جائے اور حالات کے تقاضوں کے لحاظ سے سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی نہ کی جا سکے، قرآن نے نظم حکومت کے بارے میں صرف اتنی ہدایت دی ہے کہ مسلمان آپس کے صلاح و مشورہ سے کام کریں۔ اور کوئی ایسا سیاسی نظام قائم نہ کریں۔ جس میں اہل حکومت رائے عامہ کے مشورہ سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کرنے لگیں، یا مطلق العنانی اور استبداد پر اتر آئیں۔ چنانچہ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ امور سلطنت میں مسلمانوں کے مشورہ سے کام کرو۔ وشاورھم فی الامر، جب یہ حکم نبی کے لئے ہے تو دوسرے اشخاص کے لئے جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہو، عوام الناس کے نمائندوں کا مشورہ حاصل کرنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہے اسی طرح قرآن نے مسلمانوں کی یہ بھی ایک خصوصیت قرار دی ہے کہ وہ ملک کا انتظام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں۔ وامرھم شوریٰ بینھم، یہاں بھی امر کا لفظ حاکمانہ اقتدار کے استعمال کی

غرض سے کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی اصولوں کی رُو سے مطلق العنانی استبدادیت یا کوئی غیر جمہوری طرز حکومت جائز نہیں ہے۔ جس میں جمہور کی رائے اور مشورہ کا کوئی دخل نہ ہو اور حکمران جماعت رائے عامہ کے احساسات کے علی الرغم اور جمہور کے نمائندوں کی مرضی معلوم کئے بغیر من مانی کارروائیاں کرنے پر قادر ہو۔ اسی طرح ان ہدایات سے (SECRET DIPLOMACY) کی مذمت بھی نکلتی ہے۔ کیونکہ اس طرز سیاست کی بدولت حکومتیں جمہور کے علم و اطلاع کے بغیر معاہدہ کر سکتی ہیں یا ایسی پابندیاں قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہیں۔ جن سے مفاد عامہ کو نقصان ہو۔ غرضیکہ اسلامی نظریہ سیاست کی رو سے حکومت جمہوری ہونی چاہیئے، اور عوام کے نمائندوں کے مشورہ اور علم و اطلاع بغیر کوئی اہم سیاسی کام انجام پذیر نہ ہونا چاہیئے۔ خلیفہ یا حاکم اعلیٰ کے اختیارات اور طریق تقرر کی بابت قرآن نے ہمیں کوئی واضح ہدایت نہیں دی ہے اس لئے اسلامی نظام حکومت میں ان دونوں امور کا تصفیہ مسلمانوں کی مرضی پر ہے کہ وہ حالات و مصالح کے لحاظ سے اپنے حاکم اعلیٰ کو جو اختیارات چاہیں عطا کریں اور اس کا تقرر جس اصول پر چاہیں عمل میں لائیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک خلیفہ یا حاکم اعلیٰ کے اختیارات کا تعلق ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کا طریق کار ہمارے سامنے ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ کے حالات اور موجودہ دَور کے حالات و مصالح میں بڑا عظیم الشان فرق ہے۔ خلفائے راشدین کے دَور میں مسلمانوں کے امیر کو بہت وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اس کے حاکمانہ اقتدار پر کوئی دستوری پابندی نہ تھی۔ لیکن اول تو اب حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ دوسرے اس زمانہ میں ایسے قابل اعتماد اور پکی سیرت کے لوگوں کا وجود عنقا ہے۔ اس لئے اب مصالح اس کے مقتضی ہیں کہ کسی ایک شخص کو اتنے وسیع اختیارات نہ دیئے جائیں، ورنہ ظاہر ہے کہ موجودہ دَور میں اگر کسی حاکم

اعلیٰ کو خلفائے راشدین کی طرح امور سلطنت پر غیر محدود اقتدار حاصل ہو جائے تو اُسے اپنی آمریت قائم کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا۔ بلکہ عجب نہیں کہ ایسا حاکم از سرِ نو ملوکیت اور بادشاہت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے اور یہ چیز بہر حال اسلام کے مزاج اور مسلمانوں کے مصالح کے خلاف ہوگی۔ جہاں تک امیر کے انتخاب کا تعلق ہے اس معاملہ میں خود خلفائے راشدین نے کوئی متعین طریقہ نہیں اختیار کیا۔ جس کی پابندی مسلمانوں کے لئے ضروری ہو۔ ہر خلیفہ کے بعد جب اس کی جانشینی کا مسئلہ پیش آیا۔ تو ایک جدید طریقہ انتخاب اختیار کیا گیا، حضرت عمرؓ کا انتخاب نامزدگی کے ذریعہ عمل میں آیا تھا۔ جس کی توثیق بعد میں انصار اور مہاجرین کے سربرآوردہ اشخاص نے کی حضرت عمرؓ نے اپنے بعد چھ اشخاص کو نامزد کیا تھا۔ جس میں سے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ حضرت عثمان کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے۔ لیکن امیر معاویہ نے ان کی خلافت تسلیم نہیں کی۔ اس لئے اگر خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کو بھی اُمت کے لئے نمونہ قرار دیا جائے تو بھی مسلمانوں پر خلیفہ یا امیر کے انتخاب کی بابت کوئی پابندی لازم نہیں آتی ہے۔ بلکہ مصالح حالات اور مقتضیات وقت کے لحاظ سے جو طریقہ بھی مناسب معلوم ہو اسے اختیار کرنا جائز اور مناسب ہوگا۔ البتہ خلفائے راشدین کا انتخاب مدت العمر کے لئے عمل میں آیا تھا۔ اور کسی خلیفہ کو اس کے حین حیات مسند خلافت سے معزول نہیں کیا گیا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمان بھی اپنے امیر یا حاکم اعلیٰ کو مدت العمر کے لئے منتخب کریں۔ کیونکہ اس سے آمریت کے قیام کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ جو اسلامی احکام کی رُو سے قطعاً ناجائز ہے۔ البتہ اگر مسلمانوں کا امیر یا حاکم اعلیٰ اپنے آپ کو امارت اور حکومت کا اہل اور موزوں ثابت کر دے تو اسے دوبارہ بلکہ کئی بار منتخب کیا جا سکتا ہے اور دستورِ حکومت میں اس کی گنجائش رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر حال یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق

مسلمان مذہبی حیثیت سے کوئی خاص طریقہ کار اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ اسلامی جمہوریت کس طرز کی ہونی چاہیئے۔ اس کے متعلق ہمیں قرآن نے کوئی تفصیلی ہدایات نہیں دی ہیں۔ البتہ قرآن نے حکمران جماعت کی خصوصیات پر ایک جگہ روشنی ڈالتے ہوئے اس کے لئے علم کی شرط ضروری قرار دی ہے۔ بنی اسرائیل کو جب جالوت کے ہاتھوں شکست ہونے لگی۔ اور انہوں نے اپنے پیغمبر سے استدعا کی، کہ ان پر کسی شخص کو حاکم مقرر کیا جائے۔ تاکہ وہ اس کی سرکردگی میں جالوت کے خلاف جہاد کریں تو حضرت اشموئیل علیہ السلام نے اس مقصد کے لئے طالوت کا انتخاب کیا اس پر بنی اسرائیل نے یہ اعتراض کیا کہ یہ شخص غریب طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور مال و دولت کے لحاظ سے کمتر ہے۔ وقال لھم نبیّھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکاً۔ قالوا انّی یکون لہ الملک علینا۔ و لم یوت سعۃً من المال۔ قال ان اللہ اصطفٰہ علیکم وزادہ بسطۃً فی العلم والجسم (ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، انہوں نے کہا کہ اسے ہم پر کیسے حکومت دی جاسکتی ہے، جبکہ اسے مال کی کشائش نہیں دی گئی۔ پیغمبر نے جواب دیا کہ اللہ نے اسے تم میں سے منتخب کر لیا ہے اور اسے علم اور جسم کی زیادتی عطا فرمائی ہے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں حکومت کے لئے مال کی شرط نہیں ہے اور محض اس بنا پر کوئی فرد یا طبقہ حکومت کا اہل قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ کہ مال و دولت کی فراوانی کے باعث سوسائٹی میں ممتاز اور حیثیت والا ہے۔ قرآن نے علم اور جسم کو لازمہ حکمرانی قرار دیا ہے۔ یعنی حکومت انہیں لوگوں کے سپرد کی جاسکتی ہے جو جسمانی حیثیت سے موزوں اور ذہنی حیثیت سے دوسرے افراد پر فائق ہوں۔ یہاں یہ مسئلہ حل طلب ہے کہ قرآن نے علم اور جسم سے کون سی ذہنی اور جسمانی صفات مراد لی ہیں۔ بنی اسرائیل کی قوم جن حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ ان کے مطالعہ سے

ظاہر ہوگا۔ کہ اس پر حکومت کرنے کے لئے وہی شخص موزوں ہو سکتا تھا جو شخصی حیثیت سے دلیر اور فوجی امور کا واقف کار ہو۔ اس لئے جسم کے لفظ سے قرآن فوجی مہارت اور شخصی جرأت کی صفات مراد لیتا ہے۔ اگر یہ تعبیر صحیح ہے تو موجودہ زمانہ میں جسم کی شرط ساقط ہو جانی چاہیئے کیونکہ اس زمانہ میں فوجی مہارت کا حصول حکمرانوں کے لئے ضروری نہیں رہا ہے اور نہ ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ میدان جنگ میں شخصی حیثیت سے فوج کی قیادت کریں۔ جیسا کہ زمانہ گذشتہ اور بنی اسرائیل کے عہد میں ہوا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں فن حرب ایک مستقل علم بن گیا ہے جس کے حصول کے لئے اختصاصی قابلیت ضروری ہے۔ ایسی صورت میں حکمران جماعت کے لئے فوجی مہارت کی شرط لگانا صحیح نہ ہوگا۔ البتہ اگر جسم سے مراد جسمانی تندرستی ہے تو یہ شرط اب بھی باقی ہے۔ کیونکہ جو شخص جسمانی حیثیت سے کمزور ہوگا وہ ذہنی حیثیت سے بھی بہت زیادہ بلند نہیں ہو سکتا ہے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ علم سے قرآن کی کیا مراد ہے، ہمارے خیال میں قرآن نے یہ لفظ دو صفات کے لئے استعمال کیا ہے، یعنی اولاً سیاسی تدبر اور دور اندیشی دوسرے معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے قانون سعادت کا علم، سیاسی بصیرت اور تدبیر کار کی اہلیت آج بھی حکمرانوں کے لئے ضروری قرار دی جاتی ہے۔ لیکن جس حقیقت کو آج نظر انداز کیا جا رہا ہے اور جس کی طرف قرآن نے توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ حکمران جماعت کو اُن عوامل میں بھی بصیرت حاصل ہونی چاہیئے۔ جن سے قوموں میں بلندی یا پستی، قوت یا کمزوری اور اتفاق اور اتحاد یا فساد و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ یعنی قوموں کے عروج و زوال میں خدا کی مشیت کا جو قانون کارفرما ہے اور جس کا عمل تاریخ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا صحیح علم بھی حکمرانوں کے لئے ضروری ہے۔ جو حکمران اس تاریخی اور اخلاقی بصیرت سے محروم ہوں۔ ان کی ذہنی برتری اور چالاکی سے قوم کو فائدہ

کی جگہ نقصان ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ قوم میں اخلاقی طاقت باہمی تعاون اور اتفاق و اتحاد کی جگہ طرح طرح کی بد اخلاقیاں پیدا کر کے اُسے زوال و انحطاط میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے منشاء کو وہی اہل حکومت پورا کر سکتے ہیں جو سیاسی فہم و بصیرت کے ساتھ قرآن کے فلسفہ اخلاق اور نظریہ تاریخ کا بھی علم رکھتے ہوں اور اپنے معاشرہ کو ان تمدنی اور معاشی خرابیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ جن سے قومیں زوال و ہلاکت کی نامرادی میں مبتلا ہو جاتی ہیں جو لوگ اسلام کے نظریہ حیات، فلسفہ اخلاق اور تاریخی واقعات کی بابت اس کے انداز فکر سے نا آشنا ہوں اور زندگی کے متعلق حکیمانہ اور ارتقائی نظر نہ رکھتے ہوں، وہ ایک صحیح معاشرہ کی تعمیر نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ صفات و شرائط موجودہ زمانہ میں اور زیادہ ضروری ہو گئے ہیں۔ کیونکہ حکومت کا دائرہ اثر اور اس کے اختیارات گذشتہ زمانہ کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اس لئے حکمران جماعت کے افکار و تخیلات کا اثر پورے معاشرہ پر پڑنے لگا ہے۔ قرآن نے حکمران جماعت کے لئے علم کی جو شرط لگائی ہے اس سے یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ اسلامی جمہوریت اور جمہور کے نمائندوں کو منتخب کرنے کے لئے مالی شرط (PROPERTY-QUALIFICATIONS) عاید نہیں کی جا سکتی ہیں کیونکہ قرآن نے بنی اسرائیل کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہ واضح کر دیا ہے کہ حکمرانی اور انتظام سلطنت کے لئے مالی تفوق ضروری نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی نظام حکومت میں رائے دہندوں کے لئے خواندگی (LITERACY) کی شرط ضروری ہو گی اور امیدواران انتخاب کے لئے اعلیٰ تعلیمی معیار کی شرط عائد کی جانی چاہیئے۔ تاکہ انتخابات میں صرف وہی لوگ آ سکیں جو سمجھ دار اور تعلیمیافتہ ہوں اور اپنے سیاسی اور معاشرتی مسائل کی سمجھ بوجھ رکھتے ہوں۔ اس لحاظ سے موجودہ طریقہ انتخاب غیر اسلامی ہے۔ کیونکہ اس میں محض روپیہ پیسہ کے زور اور مالی وسائل کی قوت سے امیدواران انتخاب کی نامزدگی عمل میں

آتی ہے، اسلامی جمہوریت کے انتخابی طریقوں میں اس امر کا بطور خاص لحاظ کرنا ہوگا کہ مالی مشکلات کسی شخص کے لئے انتخابات میں مزاحم نہ ہوں۔ اہل حکومت اور جمہور کے درمیان اختلاف ونزاع کی صورت میں قرآن نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف تصفیہ کے لئے رجوع کریں۔ یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم آمنتم باللہ والیوم الآخر۔ (مسلمانوں اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں حکمران ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کوئی اختلاف یا تنازعہ پیدا ہو، تو تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو) اس آیت سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں دستور اساسی مقننہ اور عاملہ دونوں پر مافوق ہوگا۔ جدید اصطلاح میں قرآن (SUPREMACY OF - THE CONSTITUTION) کے نظریہ کا حامی ہے۔ یعنی جب کبھی نمائندگان جمہور اور عاملہ میں اختلاف پیدا ہو تو اس اختلاف کا تصفیہ ایک ایسی مجلس کے سپرد کیا جانا چاہیئے۔ جس کے ارکان مزاج اسلامی سے واقف ہوں اور یہ اہلیت رکھتے ہوں کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو معاصرانہ زندگی کے حالات اور مسائل پر منطبق کر سکیں، اس طرح اسلامی نظام حکومت میں امریکہ کے (SUPREME COURT) کی طرح ایک عدالت العالیہ کا وجود ضروری ہے۔ جس کا فیصلہ مقننہ اور عاملہ کے مابین اختلاف کی صورت میں مختتم سمجھا جاتے۔ اس عدالت کے ارکان وہی لوگ ہو سکیں گے۔ جو اسلام کا حکیمانہ نقطہ نظر رکھتے ہوں اور اپنے زمانہ کے حالات ومسائل سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ قرآن میں دستور حکومت کی ایک اور خصوصیت پر بھی بڑے شدومد سے زور دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں جملہ افراد معاشرہ کو جس میں

حکمران جماعت بھی شامل ہے۔ مساوات کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے کہ
یاایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین و
الاقربین ان یکن غنیاً او فقیراً ۔ (مسلمانو! انصاف پر قائم رہو۔ کیونکہ
تمہیں اللہ کے ہاں گواہی دینا ہے۔ اگرچہ انصاف کرنے کی وجہ سے تمہاری ذات
تمہارے والدین اور اعزہ پر اس کی ضرب لگے) اور یہ انصاف ہر شخص کے مقابلہ
میں ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب) اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ
قرآن مساوات قانونی (EQUALITY BEFORE LAW) کا قیام عمل میں لانا
چاہتا ہے۔ اور کسی ایسے نظام حکومت کو پسند نہیں کرتا ہے۔ جس میں بعض افراد یا
طبقات پر ان کے مالی یا سیاسی اثر کی وجہ سے قوانین کا نفاذ عمل میں نہ آئے۔ یا ان
کے لئے مخصوص عدالتیں قائم کی جائیں۔ یورپ کے بعض ممالک بالخصوص فرانس
میں عہدہ داران نظم ونسق کے جرائم کا فیصلہ کرنے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی جاتی
ہیں۔ اسلام کے نقطہ نظر سے اس قسم کی تمام عدالتیں اور ایسی تمام مراعات خصوصی
بالکل ناجائز اور خلاف عدل ہیں۔ قرآنی اصول کی رُو سے جملہ افراد معاشرہ خواہ ان
کا تعلق عوام سے ہو یا خواص سے، امراء سے ہو۔ یا متوسط اور نیچے درجے کے طبقات
سے حکمران جماعت سے ہو یا تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں سے قانون کی نگاہ میں
یکساں اور مساوی ہیں۔ ان سب پر ایک ہی قانون کا اطلاق ہونا چاہیئے اور سب کو
ملک کی عام عدالتوں سے فیصلہ طلب کرنا چاہیئے۔ اسی طرح اس آیت سے یہ امر بھی
مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ عہدوں کی تقسیم اور سرکاری ملازمین کے انتخاب میں خویش
پروری اور اقارب نوازی کا دروازہ بند کرنے کے لئے دستور حکومت میں ایسی آئینی
مجالس کے تقرر کی گنجائش رکھی جانی چاہیئے، جو امیدواروں کو امتحان مقابلہ یا دوسرے
ذرائع سے منتخب کریں۔ نیز ایسی مجلسوں کی رکنیت کے لئے انہیں افراد کا انتخاب

عمل میں لایا جانا چاہیئے جن پہ ارباب حکومت کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔

عائلی زندگی اور حقوقِ نسواں

اسلام نے افرادِ معاشرہ کے باہمی حقوق میں میں سب سے زیادہ والدین کے حقوق پر زور دیا ہے چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ و بالوالدین احسانًا امّا یبلغنّ عندک الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اُفٍّ و قل لھما قولًا کریمًا و اخفض لھما جناح الذّل من الرحمۃ و قل ربّ ارحمھما کما ربّیٰنی صغیرًا۔ (ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ۔ اگر تمہاری زندگی میں ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو ان کے مقابلہ میں تم اُف نہ کرو بلکہ ان سے عجز و انکسار اور لطف و کرم کے ساتھ پیش آؤ اور خدا سے دعا کرو کہ وہ ان پر اسی طرح رحم کرے جس طرح انہوں نے بچپن میں تمہیں محبت اور شفقت سے پالا ہے) اس آیت کے علاوہ قرآن نے بے شمار مقامات پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے، اور ان کے احسانات کو بار بار یاد دلایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام خاندانی زندگی کی وحدت کو قائم رکھنا ضروری خیال کرتا ہے اور کسی ایسے نظام معاشرت کا روادار نہیں ہے۔ جس میں بقول اکبر، کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال آکر، کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی خاندان ہی کے ذریعے ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کرنا سیکھتا ہے اور یہی وہ اولین تربیت گاہ ہے۔ جس میں بچہ کو معاشرہ کی وسیع تر زندگی کا چھوٹے پیمانہ پر تجربہ ہوتا ہے۔ جو شخص خاندانی زندگی میں ناکام رہتا ہے اس کے لئے معاشرتی زندگی میں کامیابی حاصل کرنا بہت دشوار ہے، ان وجوہ سے اسلام مرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں اس امر کو ملحوظ رکھتا ہے کہ خاندانی زندگی میں انتشار اور (ANARCHY) نہ پیدا ہو اور کسی مقتدر ہستی کی عدم موجودگی میں خاندان کا نظم نہ بکھرنے پائے۔ نیز وہ ایسی تمام معاشرتی عادات اور

رجحانات کو روکنے کی کوشش کرتا ہے جس سے خاندانی زندگی کی وحدت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس نے زنا کو اسی لئے سخت ترین جرم قرار دیا ہے۔ کیونکہ جس معاشرہ میں زنا اور بدکاری پھیل جاتی ہے۔ اس میں خاندان کا نظم پارہ پارہ ہو جاتا ہے اسی طرح اسلام نے ناگزیر صورتوں میں طلاق کی اجازت دینے کے باوجود اسے ایک ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے۔ کیونکہ طلاق کی کثرت ازدواجی اور عائلی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ اسلام میں مردوں اور عورتوں کے حقوق وفرائض مساوی قرار دیئے گئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی مرد کو ایک درجہ فضیلت دی گئی ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے، ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة، (اور عورتوں کے مردوں پر بھی ویسے ہی حقوق ہیں۔ جیسے مردوں کے عورتوں پر البتہ مرد کو ایک درجہ فضیلت حاصل ہے) اس طرح قانون کی نگاہ میں مرد اور عورت دونوں کی یکساں حیثیت ہے۔ مگر گھریلو اور خاندانی امور میں مرد کی رائے اور فیصلہ کو زیادہ وزن دیا گیا ہے تاکہ اس چھوٹی سی حکومت میں دو مساوی اقتدار نہ پیدا ہو سکیں۔ جس سے اس کا انتظام درہم برہم ہو جائے۔ اسلام عورتوں کو وہ تمام آزادیاں دیتا ہے جو خاندانی نظم کے منافی نہ ہوں۔ چنانچہ عورتوں کو مال ودولت کے حصول اور جائداد کی ملکیت کا ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا مردوں کو۔ قرآن نے اس بارے میں صاف طور پر تصریح کر دی ہے کہ عورتیں جو مال حاصل کریں وہ اُن کا ہے، وللنساء نصیب مما اکتسبن۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورتیں اپنا ذریعہ معاش آپ پیدا کریں تو اسلام اس کو قابل اعتراض نہیں قرار دیتا ہے غرضیکہ عورتوں اور مردوں کے درمیان اسلام نے کم وبیش مساوات قائم کر دی ہے۔ البتہ وحدت خاندانی کے قیام کی غرض سے مرد کو عورتوں کے بالمقابل کچھ اختیارات زیادہ عطا کئے ہیں۔ اسلام مروجہ پردے کا حامی نہیں ہے

جس کے تحت عورتوں کو باندیوں کی طرح گھروں میں بند کر دیا جاتا ہے ۔ وہ عورتوں
کو تعلیم و تفریح اور دوسرے مشاغل کی غرض سے باہر جانے کی اجازت دیتا
ہے ۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان کے لباس اور وضع قطع اور چال ڈھال سے
بد چلنی اور شہوت رانی کا دروازہ نہ کھلنے پائے ۔ چنانچہ وہ مردوں اور عورتوں دونوں
کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں ۔ قل للمومنین یغضوا من ابصارھم
و یحفظوا فروجھم ذالک ازکی لھم واطھر ان اللہ خبیر بما تعملون ۔ وقل
للمومنات یغضضن من ابصارھن و یحفظن فروجھن ولا یبدین
زینتھن الا ما ظہر منہا (مومنوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور شرم
گاہوں کی حفاظت کریں ۔ نیز اپنی زینت کا اظہار نہ کریں بجز اس کے کہ جو زینت
ظاہر ہو جائے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورتیں ایسا لباس نہ اختیار
کریں جس سے ان کی زینت کا اظہار مردوں پر ہو اور جنسی ترغیب کا اندیشہ پیدا
ہو تو وہ گھروں سے باہر نکل سکتی ہیں ۔ بیشک قرآن میں ایک جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ
عورتوں کو گھروں میں ٹھہرنا چاہیئے ۔ وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج
الجاھلیۃ الاولیٰ (اور تمہیں چاہیئے کہ گھروں میں قرار حاصل کرو اور جاہلیت کے
زمانہ کی طرح ناز و انداز اور زینت و آرائش کے ساتھ باہر نہ جاؤ) لیکن اس
کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں کو گھروں میں بالکل بند رکھا جائے بلکہ اس حکم کا منشا
صرف اس قدر ہے کہ عورتوں کی دلچسپیوں کا مرکز و محور ان کے گھر ہونے چاہئیں
اور انہیں بلا ضرورت باہر نہیں جانا چاہیئے اسی طرح مردوں کا عورتوں کی مجلسوں میں شریک
ہونا اور عورتوں کا مردوں کی محفلوں میں آزادانہ شرکت کرنا جائز نہیں ہے ۔ بجز اس کے کہ عمر رسیدہ
عورتیں کسی ضرورت کے تحت مردوں کے ساتھ مل کر کام کریں ۔ اس طرح اسلام
نے اگرچہ مرد اور عورت کو یکساں حقوق دیئے ہیں ۔ لیکن عورتوں کو یہ بھی حکم دیا ہے

کہ وہ خاندانی اور گھریلو زندگی کو دلچسپیوں کا مرکز بنائیں۔ محض تفریح اور لہو و لعب کی خاطر مرد و زن کا آزادانہ اختلاط اسلام کی رُو سے جائز نہیں ہے کیونکہ تمدن کے بقاء اور معاشرتی اعتدال کے لئے اس سے زیادہ بری چیز اور کوئی نہیں ہے، کہ سوسائٹی پر صنفی خواہشات کا غلبہ ہو جائے اور جنسی ترغیبات کی تمام راہیں کھول دی جائیں۔ جس سوسائٹی میں ہوا و ہوس کی تکمیل اور جنسی خواہشات کے غلبہ کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے اور مردوں اور عورتوں کے لئے ایسے مواقع فراہم کر دیئے کر دیئے جاتے ہیں۔ جن سے ان کے نفسانی جذبات بھڑک اٹھیں، وہ بہت جلد ذہنی اور جسمانی انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسلام ایک ایسے معاشرہ کے قیام کا حامی ہے جس میں عورتوں اور مردوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہوئے بھی صنفی انارکی نہ پیدا ہو۔

صفحات بالا میں ہم نے اسلام کے بنیادی اصولوں کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کے جزئیات و فروعات میں بلحاظ حالات تبدیلی عمل میں آسکتی ہے۔ لیکن اس کے بنیادی اصول اٹل اور ناقابل تغیر ہیں۔ اس طرح اسلام ارتقائے حیات میں مزاحمت نہیں پیدا کرتا ہے بلکہ اس کا معاون اور مددگار ہے۔ لیکن جس طرح ارتقائے انسانی بھی بالآخر ایک ایسے اصول اور قانون کا تابع ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے اسی طرح جزوی اور فروعی مسائل اور تفصیلی قوانین میں اسلام تغیر احوال کے مطابق بڑی وسیع تبدیلیوں کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن بنیادی اصولوں اور کلیات قانون کے دائرہ میں وہ ادنیٰ سے تغیر کو بھی گوارا نہیں کرتا ہے۔

اصولِ اسلام

خواجہ عباد اللہ اختر بی، اے

حرفِ مطلب

اصل و فرع

ارشاد قرآن ہے :-

الم ترکیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء، توتی اکلہا کل حین باذن ربہا، ویضرب اللہ الامثال للناس لعلہم یتذکرون، ومثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالہا من قرار، یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الآخرۃ ویضل اللہ الظالمین، ویفعل اللہ مایشاء۔

(۱۴/۲۴)

کیا تو مشاہدہ نہیں کرتا کہ اللہ نے کیسی پاکیزہ بات دربارۂ اصول بیان فرمائی ہے کہ پاکیزہ درخت جیسی ہے جس کی جڑ زمین کے اندر ثابت ہے اور اس کی ڈالیاں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں اپنا پھل ہر ایک وقت مقررہ پر اپنے پروردگار کے اذن سے دیتا ہے۔ اور اللہ مثالیں اس لئے بیان فرماتا ہے کہ لوگ کچھ تو تذکر سے کام لیں اور ناپاک کلمہ کی مثال ناپاک درخت جیسی ہے کہ زمین کی سطح پر پڑا ہے اور اسے قرار و ثبات نہیں اللہ ان لوگوں کو دنیوی اور اخروی زندگی میں برقرار رکھتا ہے جو اصول (قول الثابت) پر ایمان لائے اور گمراہ کرتا ہے ظالموں کو اور جو بھی اللہ چاہے کرتا ہے

درخت کی جڑ زیر زمین ہوتی ہے اور وہی بنیاد ہے۔ یہ "اصل" جتنی عمیق تر ہوگی اتنی ہی مضبوط ہوگی۔ اس کے خلاف وہ نباتات یا جھاڑیاں ہیں جو سطح زمین پر

حشرات الارض کی طرح رینگتی ہیں۔ انہیں قرار و ثبات نہیں۔ جلدی ان کا نشو و نما ہوتا ہے اور جلد ہی فنا ہو جاتی ہیں۔ درخت کی اصل یعنی جڑ بظاہر نظروں سے اوجھل ہوتی ہے۔ ہم درخت کی شاخوں اور شاخوں میں پتوں اور پھول اور پھل کو دیکھتے ہیں یہ سب "فروع" ہیں۔ شاخیں ٹوٹ جاتی ہیں، پتے جھڑ جاتے ہیں، پھول وقت پر اپنی بہار دکھاتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ پھل گدگداتے ہیں، رنگت پر آتے ہیں اور پختہ ہو کر رزق بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر درخت کی اصل ثابت ہے تو پھر وقت پر ہری ہری کونپلیں نکل آتی ہیں اور درخت عظمت اور وقار سے سربلند کئے ہوتے ہے اس کی شاخیں ہر طرف پھیل رہی ہیں اور ان پر پرندے بسیرا اور انسان اور بہائم اس کے سایہ میں آرام لیتے ہیں۔

اِختلاف کسی درخت کے دو پتے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ اختلاف فطری ہے۔ اور اختلاف اور "کثرت" لازم و ملزوم ہیں۔ یہ اختلاف اور کثرت جو فطرت کی پیدا کردہ ہے سراسر رحمت ہے۔

"اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے"

"اختلاف" لفظ خلف سے مشتق ہے۔ "خلف" کے معنی ہیں جو پیچھے آئے۔ باپ کا بیٹا خلف ہوتا ہے۔ رات دن کے بعد اور دن رات کے بعد آتا ہے اور ایک دوسرے کے خلف ہیں۔ ایک اختلاف وہ ہے جو ہوائے نفس کا پیدا کردہ ہے اور اسی سے شر انگیز تفرقہ کا ظہور ہوتا ہے اور انتہائی مذموم اور موجب عذاب ہے۔

"ہربرٹ سپنسر" جو علم معاشرت کا بہت بڑا مستند عالم ہے، لکھتا ہے کہ انسان کے کلام اور کام میں اختلاف واجب ہے۔ اگر خلف سلف سے اختلاف نہ کریں تو ذہنی اور مادی ارتقاء ختم ہو جائے گا۔ اختلاف نہیں ہے تو صرف قوانین فطرت میں اول تو کسی زمانہ کے حکماء کے نظریوں میں اختلاف ضرور ہوتا ہے اور

اگر یہ ممکن بھی ہو کہ ان کا اتفاق کسی ایک امر پہ ہو جائے تو ناممکن ہے کہ خلف ان سے اختلاف نہ کریں۔

ارشاد قرآن ہے کہ:۔

و من آیۃ خلق السموات و الارض واختلاف السنتکو والوانکم ان فی ذلک لآیت للعلمین (۲۲/۳۰)	اور اس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہاری بولیوں اور رنگتوں میں اختلاف پیدا کیا ان میں عالموں کے لئے پتہ کی باتیں ہیں۔

اہل علم و حکمت جانتے ہیں کہ ارض و سموٰت کی تخلیق کس طرح ہوئی اور یہ کہ موجودہ ارتقائی صورت میں یہ بے شمار تغیرات کے بعد رونما ہو رہے ہیں۔ اور یہ تغیرات جاری ہیں اور کسی دن ان کی صورت کچھ اور ہی ہوگی "یوم تبدل الارض غیر الارض والسموٰت" (۴۸/۱۴) عالم انسانی کی بولیوں اور رنگتوں میں جو اختلاف مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اس کے اسباب بھی فطری ہیں مارض و سموٰت کی اصل ایک "قوت" (ENERGY) ہے اور بولیوں اور رنگتوں کی تہ میں انسانیت ہے۔ باہمہ اختلاف انسان ہر ایک زمانہ اور ہر ایک مکان میں انسان ہی ہے یہ اور بات ہے کہ باتباع ہوائے نفس قوموں کو اس اختلاف میں خطرہ محسوس ہوتا ہے اور کالے اور گورے نے شر انگیز تفرقہ انسانوں میں پیدا کر رکھا ہے۔

الغرض قانون اختلاف (LAWS OF VARIATION) میں حکمت ارتقا رکھی ہے۔ لیکن اختلاف صرف صورتوں میں ہوتا ہے۔ کسی شے کی قلب ماہئیت نہیں ہوتی یا یوں کہیئے کہ اصل تو ہمیشہ برقرار اور ثابت رہتی ہے مگر فروع میں تغیر و تبدل و اختلاف ہوتا رہتا ہے اور جہاں تک تقاضا فطرت ہے یہ ناگزیر امر ہے۔

"اسلام" شجرہ طیبہ ہے۔ اس کی اصل تو ثابت ہے اور یہ ایک ہی "دین" ہے قرآن میں "دین" بصیغہ واحد ہی استعمال ہوا ہے۔ البتہ مذاہب میں اختلاف

ہے جو اصل دین کی فروع ہیں۔ یوں تو مذاہب بے شمار ہیں مگر قرآن میں بالخصوص اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہی کا مذکور ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عالم انسانی کی اکثریت انہی مذاہب کی تابع ہے جو اسلام کے فروع ہیں۔ ارشاد قرآن ہے کہ

قل یاھل الکتب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ، فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔ (۳/۱۴)

اہل کتاب کو کہو کہ ایک اصولی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں ایک ہی تسلیم شدہ حقیقت ہے وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اس کا شریک کسی شے کو نہ مانیں اور ہم میں سے ایک دوسرے کو ارباب من دون اللہ نہ مقرر کرے اور اگر تم کو یہ پیشکش قابل قبول نہ ہو تو گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں اور اسی اصل اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔

قرآن کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ آفرینش سے دین اصل میں ایک ہی ہے اور کل انبیاء اور رسل کا یہی دین رہا ہے۔ لوگوں نے کچھ تو جہالت اور کچھ باہمی بغض و حسد غرض باتباع ہوائے نفس اس میں شاخسانے نکالے۔ یہ فروع دین نہیں ہیں۔ اہل کتاب اتنا تو تسلیم کرتے ہیں کہ اصول دین یہی کچھ ہیں جو ان کی کتب مقدسہ میں مذکور ہیں مگر

قالت الیہود لیست النصریٰ علی شیء وقالت النصریٰ لیست الیہود علی شیء، وھم یتلون الکتب کذلک قال الذین لا یعلمون مثل قولھم (۲/۱۳)

یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی شے پر نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں یہود کسی شے پر نہیں (لطف یہ ہے کہ دونوں) ایک ہی کتاب (بائبل) کی تلاوت کرتے ہیں اور اسی قسم کی وہ بھی باتیں بناتے ہیں جن کو حقیقت کا علم نہیں۔

یہود و نصاریٰ تو اعتقاداً اور عملاً اصول دین فراموش کر چکے ہیں ان میں فرقہ در فرقہ اور شر انگیز تفرقہ بھی ہے۔ اب آیئے ہم اپنے گھر کی خبر لیں۔ خیریت سے یہاں بھی

فرقہ بندی کی کمی نہیں۔ لیکن ایک بات نمایاں ہے وہ یہ کہ اعتقاداً اصول دین جوں کے توں ہیں اور ہر ایک فرقہ کا ایمان ایک کتاب ایک رسول اور ایک اللہ پر بالاتفاق ہے۔ اختلاف ہے اور ضرور ہے تو صرف فروع میں۔ جہاں تک ان فروع کا تعلق اصل دین سے ہے عین منشاء فطرت کے مطابق ہے لیکن جس حد تک شر انگیز تفرقہ کی صورت ہے انتہائی مذموم ہے۔ اسی کو رفع کرنے کے لئے اور سد باب کے لئے ارشاد قرآن ہے کہ

یاایها الذین امنوا ان تطیعوا فریقاً من الذین اوتوا الکتٰب یردوکم بعد ایمانکم کٰفرین الایۃ (پ۴)	اے مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے کسی فرقہ کی اطاعت کروگے تو تم کو ایمان لانے کے بعد اصل دین سے مرتد بنا کر کافر بنا کر چھوڑیں گے اور تم سوچو تو سہی کہ کیوں کفر قبول کروگے حالانکہ تم پر اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور تم میں رسول ہے۔

اور جس نے مضبوطی سے (کتاب) اللہ کو پکڑے رکھا تو وہی سیدھی راہ پر ہولیا۔ اے ایمان والو بوجہ اللہ کما حقہ تقویٰ اختیار کرو اور مرتے دم تک مسلمان ہی رہو اور اللہ کی دستاویز سب بالاتفاق بلا اختلاف و تفرقہ مضبوطی سے پکڑے رہو اور اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم میں باہمی دشمنی تھی تو تمہارے پھٹے ہوئے دلوں کو ملایا اور تم اللہ کی نعمت سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے تو تم کو گرنے سے بچایا۔ اس طرح اللہ اپنی آیات کو دربارۂ ہدایات کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم بھٹک نہ جاؤ اور مناسب ہے کہ تم میں سے ایک امت (شوریٰ) ہو جو تم کو نیکی کی دعوت دے اور متعارف معقول باتوں کا امر اور نامعقول باتوں سے منع کرے۔ وہ اور تم مقصد زندگی فلاح حاصل کرلوگے اور ان لوگوں (اہل کتاب) کی طرح نہ ہونا جو آیات بینات کے ہوتے شر اور اختلاف میں مبتلا ہوگئے ان کے لئے دائمی عذاب ہے۔

اسباب تفرقہ اسباب تفرقہ ایک ہی ہیں خواہ اہل کتاب میں یا مسلمانوں میں کارفرما ہوں۔ ان اسباب کی تحقیق اور ان پر مفصل بحث کی گنجائش تو نہیں۔ لیکن ہم ایک اصولی سبب جس کا مذکور قرآن کی متعدد آیات میں کیا گیا ہے، بتاتے ہیں اس شر انگیز تفرقہ کا راز "اسماء" میں مضمر ہے۔

فاضل "رینان" پولوس کے سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ جسے اب "مسیحیت" (CHRISTIANITY) کہتے ہیں۔ یہ نام نہ یسوع مسیح اور نہ حواریان مسیح نے تجویز کیا۔ یہ اختراع پولوس کی ہے جو کبھی مسیح کی صحبت میں نہ رہا بلکہ حواریوں سے بھی کنارہ کش رہا۔ مسیح کا جو تصور اس کے ذہن میں تھا وہ حواریوں کے مسیح سے بالکل مختلف تھا۔ اس سے پیشتر حواری اور یہود مل جل کر ہی رہتے اور بظاہر ان کے اعمال میں بھی کچھ اتنا نمایاں فرق نہ تھا اور حکومت وقت رومی بھی ان کو زیادہ سے زیادہ ایک فرقہ سمجھتی، حواری انجیل کی تبلیغ غیر یہود نامختون میں جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن پولوس نے خود ساختہ انجیل کا پرچار رومیوں اور یونانیوں میں کیا۔ ان کی صنمیات میں پہلے ہی دیوتا اور دیویاں تھیں اس نے بھی مسیحیت کو اسی رنگ میں پیش کیا۔ مقدس یوحنا حواری پولوس کو ضال اور دجال کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ ہم میں دجال کی آمد کی پیشگوئی مشہور ہے یہ وہی شخص ہے جو مسیح کو بشر نہیں کہتا بلکہ الوہیت کا درجہ دیتا ہے۔ یہی پولوسی مسیحیت یورپ کا مذہب ہو گئی۔ فاضل "رینان" لکھتا ہے کہ صرف مسیحیت کے نام نے یہ سارا اختلاف اور تفرقہ ڈالا۔ حواری اپنے آپ کو مسیح کے نام سے وابستہ نہیں کہتے تھے۔ اپنے آپ کو اخوان اور مومنین ہی کہتے لیکن مسیحیت نے یہود سے پیروان پولوسی مسیح کو بالکل الگ کر دیا۔ چونکہ یہ جماعت مسیح کے نام سے وابستہ ہو گئی اس لئے اس مذہب کی زندگی مسیح کی زندگی سے وابستہ ہو گئی۔

"اسم" کی اصل "سمو" ہے۔ مفہوم نام یا نشان یا علامت جس سے ایک شے دوسری شے سے ممیز ہوتی ہے۔ کسی شے یا شخصیت کی امتیازی ہستی کی شناخت نام ہی سے ہوتی ہے۔ اسم مسمیٰ پر دلالت کرتا ہے اور جب بلحاظ اوصاف کسی شخصیت کا کوئی نام ہو تو ضرور ہے کہ یہ اوصاف اس کی ذات میں پائے جائیں اور اگر مسمیٰ موجود نہ ہو تو محض نام ہی نام بے حقیقت شے ہے یہ دیوتا اور دیویاں ذہن انسانی نے اختراع کیں اور نام بھی گھڑ لئے۔

ان ھی الا اسمآء سمیتموھا انتم و آباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطٰن ان یتبعون الا الظن و ما تھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدیٰ۔ (پ)	یہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے گھڑ لئے ہیں اللہ نے تو اس کی کوئی سند نازل نہیں فرمائی یہ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے جی نے چاہا اور البتہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے (اس کے ہوتے گمراہ ہوں تو ہوں)

اہل نظر جانتے ہیں کہ عقیدت مند والہانہ جوش میں اپنے بزرگوں کو ان کی وفات کے بہت عرصہ بعد بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور ان میں وہ وہ اوصاف بتاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ ان کو خدا سے ملا دیتے ہیں۔ ان بزرگوں کا تصور جو کچھ ان کے ہم عصر لوگوں کے ذہن میں ہوتا ہے اس سے بہت مختلف آئندہ نسلوں کو ہوتا ہے وہ در اصل نام تو ان بزرگوں کا ہی لیتے ہیں لیکن ان کا اپنا خیالی بُت ہوتا ہے جس کی پوجا وہ خود کرتے ہیں۔ پولوس نے جو تصور مسیحؑ کا پیش کیا اس کی تصدیق شاگردان مسیحؑ نہیں کرتے۔

بلاشبہ اصلاحی تحریکات ہر ایک زمانہ میں مصلحان وقت کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب ان کو کسی نام سے موسوم کیا جائے تو فوراً ایک امتیاز پیدا ہو جائے گا۔ اور ایک نیا فرقہ بن جائے گا۔ یہ ناموں ہی کا کرشمہ ہے کہ آج ہر ایک قوم

فرقہ در فرقہ تقسیم ہو چکی ہے اور ان میں رفتہ رفتہ منافرت مغائرت کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ اگر یہ نام محو کر دیئے جائیں تو آج ہی یہ تفرقہ مٹ جاتا ہے۔ اس لئے یہ ضرور ہے کہ ہر ایک مصلح پہلے ہی یہ سمجھ لے کہ ایک خرابی کی اصلاح کی جگہ وہ بدرجہا بدتر خرابیاں پیدا کر دے گا۔ اگر اس نے اپنی تحریک کا کوئی نام تجویز کیا یا اس کی اجازت معتقدین کو دی۔

مسلمانوں میں بے شمار فرقے پیدا ہوئے اور ختم ہو گئے اور ان کی جگہ نئے نئے فرقوں نے لے لی ہر ایک فرقہ کا ایک نہ ایک نام مشہور ہے۔ اصل دین اسلام سے موسوم ہے اور جو اسے قبول کرتا ہے مسلم کہلاتا ہے۔ اس دین کی تعریف قرآن میں جو کچھ کی گئی ہے اس کا حوالہ ہم نے اس کتاب میں دیا ہے مختصر یہ کہ یہ دین اللہ ہے لہ اسلم من فی السموات والارض۔ اور کل کائنات کا دین الفطرت ہے یہ کسی قوم کسی شخصیت کسی ملک کا نام نہیں، جیسے یہودیت یا مسیحیت یا ہندو ازم کے تحت بے شمار فرقے ناموں سے موسوم ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے بھی فرقہ بندی پیدا کی اور اپنے آپ کو بشری ناموں سے وابستہ کر لیا۔ اگر یہ پسندیدہ بات ہوتی تو قرآن محمدی یا احمدی نام تجویز کرتا۔ ہم نے اس کتاب میں اس موضوع پر بھی اصولی بحث کی ہے۔ الحمد للہ اب تعلیم یافتہ طبقہ پر ان ناموں کا جادو نہیں چلتا۔ اور وہ وقت دور نہیں جب مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہوں گے۔ جیسے کہ وہ آنحضرت ؐ کے عہد مبارک میں تھے۔

لیکن ہم اگرچہ فرقہ بندی اور تفرقہ کے خلاف ہیں۔ مگر بہ تقاضائے وقت اصلاح واجب سمجھتے ہیں اور ہر ایک مصلح کو اصلاح پیش کرتے وقت جماعت بندی سے محترز رہنا چاہیئے اور نہ حلقہ ارادت قائم کرنا چاہیئے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کی نیت نیک نہیں اور اہل عقل کے نزدیک مردود ہے وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ

کی مسجد علیحدہ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ ایسے لوگ عموماً بیکار بے روزگار ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کا مال ناحق ڈھکوستے ہیں۔

یاایھا الذین آمنوا ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ۔	اے مسلمانو! اکثر درویش (خانقاہ) اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق ڈھکوستے ہیں (سمجھے تو یہ جاتے ہیں کہ خدا رسیدہ ہیں مگر) اللہ کے راستہ کو لوگوں پر بند کرتے ہیں۔

اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ان میں شر انگیز تفرقہ اور فرقہ بندی ختم ہو جائے تو وہ صرف اتنا کریں کہ اپنے آپ کو صرف مسلم کہیں اور کسی اور نام سے وابستہ نہ کریں فرقہ بندی اور تفرقہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

ارکانِ اسلام

چونکہ ہم نے اس کتاب میں صرف اصول اسلام پر بحث کی ہے اس لئے ان سطور میں یہ حقیقت واضح کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اصل اصول اسلام، ایمان باللہ والیوم آخر ہے۔ صوم و صلوٰۃ اور زکوٰۃ و حج ارکان اسلام اصول احکام کی تشکیل ہیں۔ اصول فطری ہوتے ہیں اور ان میں تغیر و تبدل ممتنع ہے۔ ارکان اور جو بھی اعمال کی صورت میں محسوس ہو۔ وہ اصول کے فروع میں ہی داخل ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک درخت کی صرف جڑ ہی جڑ ہو تو ہم اسے درخت نہیں کہیں گے۔ ہماری مادی اور ذہنی ضروریات کی تسکین فروع ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ اصل شے درخت کی جڑ ہی ہے اور فروع کا قیام اسی اصل شے سے ہے۔ اگرچہ اصل شے نظروں سے اوجھل ہوتی ہے مگر ثابت اور برقرار یہی رہتی ہے۔ اکثر کوتاہ بین اصل کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں اور فرع کو اصل شے تصور کرتے ہیں اور یہ بھی تفرقہ اور فرقہ بندی کا بہت بڑا سبب ہے۔ حضرت مسیحؑ سے ایک دفعہ فریسی علماء یہود نے پوچھا کہ کیوں تیرے شاگرد بزرگوں کی قائم کردہ رسوم کے پابند نہیں۔ فرمایا کہ تم تو توحید

کو جو اصل شے ہے نظر انداز کرتے ہو اور ایسی باتوں کی نسبت جو جزو دین بھی نہیں سختی سے پابندی کا حکم کرتے ہو۔ مسلمانوں میں اختلاف انہی فقہی مسائل میں ہے جو اجتہادات وقتی اور ہنگامی ائمہ دین کے تھے۔ اور ایک زمانہ کے خاص حالات کے مقتضی تھے۔ حالات بدل گئے مگر ان کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے اور ان مسائل نے اصول کی طرح مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ حالانکہ یہ ارکان اسلام بھی نہیں جن کا مذکور قرآن میں ہے۔ چونکہ ارکان اسلام مستقل موضوع ہے اس لئے اس پر تفصیلی بحث کسی آئندہ صحبت میں کی جائے گی۔ اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ ایمان باللہ والیوم الآخر کے صحیح تصور کے بغیر ہر ایک عمل خواہ وہ ارکان اسلام کی صورت میں ہو بے معنی ہے۔

متشابہات اہل کتاب یہود و نصاریٰ میں ہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں میں بھی فرقہ بندی کا موجب آیات متشابہات ہیں۔ اس قسم کی بعض آیات کتب مقدسہ سابقہ توراۃ و انجیل و صحف انبیاء کی بغرض تصدیق قرآن میں بطور حوالہ مذکور ہیں۔ قرآن کی ذمہ داری اتنی ہے کہ حوالہ الفاظ کا صحیح ہے۔ یہ آیات تاویل کی محتاج ہیں اور تاویل اللہ تعالیٰ بذریعہ محکمات قرآن فرماتا ہے چونکہ غلط فہمی سے معجزات وغیرہ پر ایمان لانا بھی اصول اسلام میں داخل سمجھا گیا ہے اور ان معجزات پر جو انبیاء سے منسوب ہیں۔ اس لئے ہم نے متشابہات پر تفصیلی بحث کی ہے تاکہ اصول اسلام کے متعلق کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ اس کا ایک فائدہ مزید یہ بھی ہو گا کہ قرآن عظیم کی حیثیت کتب مقدسہ میں نمایاں معلوم ہو جائیگی۔

آیہ مبارکہ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (پ)

اور اکملت علیکم نعمتی کا یہ مفہوم ہے کہ دین ایک ہی ہے اور یہ وہ نور ہے جو تمام انبیاؤ رسل کے شمع نبوت و رسالت سے جزواً بہ تقاضائے وقت ضیا پاشی کرتا رہا۔

آنحضرتؐ کے مشکوٰۃ نبوت میں یہ کلمہ اپنے کمال پر ظاہر ہؤا۔ اور اسکی تکمیل بذریعہ قرآن ہوگئی۔ یا دوسرے لفظوں میں اس طرح کہو کہ ہر ایک شمع نبوت کا نور مجتمع ہو کر جلوہ افروز ہؤا لیکن ہم اس نور کی کرنوں میں تفریق نہیں کر سکتے۔ یہ مفہوم ہے آیہ "لا نفرق بین احدٍ" کا اور اس لحاظ سے کہ ایک رسول کے بعد دوسرا رسول پہلے رسول کے نور کا بھی وارث ہوا۔ یہاں تک کہ آنحضرت تمام رسل سابقہ کے انوار رسالت کے وارث ہوئے اور اس پر اضافہ بغرض تکمیل اور بھی ہؤا۔ یہ ہے مفہوم آیہ "تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعضٍ" (پ۳) کا۔ سورہ بنی اسرائیل میں کتاب موسیٰؑ کی نسبت کہا گیا ہے کہ "جعلنٰه هدی لبنی اسرائیل" اور قرآن کی نسبت کہا گیا ہے "یهدی للتی هی اقوم"۔ "اقوم" مبالغہ کا صیغہ ہے۔ توراۃ ایک قوم بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیئے اور قرآن تمام عالم انسانی کے لئے نازل ہؤا۔ جس میں بنی اسرائیل بھی شامل ہیں۔ اس لئے قرآن میں توراۃ کا نور اور دیگر کتب مقدسہ کے انوار بھی شامل ہیں۔ اس لئے توراۃ کی نسبت بھی کہا گیا ہے: "فیها هدی ونور" (پ۶) اور یہی الفاظ انجیل کی نسبت استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں یہ سب انوار شامل ہیں۔ لیکن ان کی تفریق نہیں ہو سکتی۔

حق و باطل میں تمیز ہر ایک شخص نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دنیا باطل پرست ہے۔ قرآن میں حق و باطل کی مثال بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے کہ "فاما الزبد فیذهب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض" (پ۱۳)۔ جو شے ناکارہ ہوتی ہے وہ فنا ہو جاتی ہے اور جو شے لوگوں کے لئے نفع بخش ہے وہ زمین میں باقی رہتی۔ "کذلک یضرب الله الحق والباطل" اس طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان فرماتا ہے

حق و باطل دو نسبتی امور ہیں۔ اللہ تعالیٰ حق ہی پیدا کرتا ہے اور انسان کسب

کرتا ہے۔ "باطل انہ باطل بر دید حق زحق"۔ لیکن وضع جہان اس طرح واقع ہوئی ہے۔ کہ ہر ایک شے پر تغیرات ہر آن واقع ہوتے رہتے ہیں اور اس کی صورت بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی ارتقاء کی طرف سے جاری ہے۔ اگر ہر ایک شے ایک حال پر رہے تو ارتقا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے ارشاد قرآن ہے۔ "والآخرۃ خیرلک من الاولیٰ" اور "والآخرۃ خیر و ابقیٰ" اوّل سے آخر بہتر ہے اور جو بہتر شے ہے وہ باقی رہتی ہے، اور یہ نفع بخش ہوتی ہے۔ مگر اس شے کا اوّل بھی جو اب ناکارہ ہو گیا ہے کسی وقت نفع بخش ہی تھا۔ یہ شے معدوم نہیں ہوتی۔ بلکہ اسی شے کو ارتقاء میں مدد بھی دیتی ہے۔ یا کوئی اور مفید صورت اختیار کر لیتی۔ اس لئے ارشاد الہٰی ہے۔ یہی مثال حق و باطل بیان کرنے کے بعد ہے کہ "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتے یغیروا ما بانفسھم واذا اراد اللہ بقوم سوءً فلا مرد لہٗ وما لھم من دونہ من وّال" (ب) اللہ تعالیٰ کسی قوم کے معاملات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت کو (خارجی حالات کے مناسب) نہ بدلے اور (جب نہیں بدلتی) مشیت الہٰی (ایسی حالت میں یہ ہوتی ہے) کہ اس قوم کے بُرے دن آجاتے ہیں جو ٹالے سے نہیں ٹلتے (اور اگر اللہ کی طرف رجوع کرے تو) اللہ کے سوا بگڑی بنانے والا بھی اور کوئی نہیں۔

قومیں جو خارجی حالات کے مناسب اپنی ذہنیت نہیں بدلتیں ان پر بھی جمود چھا جاتا ہے اور وہ رجعت پسند ہوتی ہیں اور پرانی لکیر پیٹتی رہتی ہیں اور یہی کہتی ہیں کہ ہم نے اپنے آباواجداد کو جس روش پر چلتے دیکھا ہم بھی اسی پر چل رہے ہیں۔ مسیح ؑ نے کہا کہ اگر میں تم کو ایسی بات بتاؤں جو بہ تقاضائے حالات بہتر ہے۔ تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے کہ تسلیم کر و۔ یہود نے انکار کیا۔ آنحضرت ؐ نے یہود و نصاریٰ کو بھی یہی کچھ کہا، حالانکہ مسیح ؑ نے بھی کہا کہ میں توراۃ کو منسوخ کرنے نہیں

آیا ہوں بلکہ تکمیل کرنے کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔ آنحضرت صلعم نے بھی یہی کہا کہ میں اس نور کی تکمیل کر رہا ہوں جو توراۃ و انجیل میں ہے مگر کسی نے نہ سنی۔ اصول دین تو مستقل شے ہے جو توراۃ و انجیل و قرآن میں احکام و امثال و محکمات میں بیان کئے گئے ہیں، فروع جو وقتی امور ہیں بہ تقاضائے حالات خارجی بدلتے رہے اور خود انبیاء بنی اسرائیل بدلتے رہے۔ مسیح علیہ السلام نے تو سبت کا بھی احترام اٹھا دیا تھا۔ لیکن فروع چونکہ شے محسوس ہوتی ہے قومیں اسی کو اصل دین سمجھتی ہیں اور ان سے لپٹی رہتی ہیں اگر ہم بھی ذرا ٹھنڈے دل سے اپنے تنزل کے اسباب پر غور کریں تو اسباب ایک ہی ہیں۔ ہم بھی رجعت پسند ہیں اور خارجی حالات کے تقاضا کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تفقہ فی الدین کی ضرورت ہے۔ اور ہر ایک زمانہ میں ضرورت ہے۔ ارتقا میں رجعت نہیں، رجعت ہلاکت کے ہم معنی ہے۔

اصُولِ اسلام

اَلْاِسْلَامُ لفظ "اسلام" مشتق ہے "سلم" سے جس کے معنی صلح و آشتی اور صحت بدن و حواس و عقل ہیں۔ ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کی آیات میں بھی استعمال ہُوا ہے۔

"وَاَلْقَوْا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ" (النساء ۹۰) | اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا پیام دیں

"وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا" (الانفال ۶۱) | اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی ان کے لئے اسی طرف جھکو۔

"رَجُلًا سَلَمًا" (الزمر ۲۹) | ایک صحیح المزاج تندرست، خودمختار آدمی۔

"سَلَّمَ" کا مفہوم ہے لڑائی جھگڑوں کے بُرے نتائج سے محفوظ و سلامت رہنا۔

وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ" (الانفال ۴۳) | البتہ تم اس امر میں جھگڑتے لیکن اللہ نے تم کو تنازعہ کے بُرے نتائج سے سلامت رکھا۔

کمزور اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتا۔ اس لئے کسی طاقت ور کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ یہ مفہوم بھی اس لفظ کا ہے۔ کسی حکم یا امر یا بات کا ماننا تسلیم کرنا۔ شیطان کے حملوں کی مدافعت اللہ کی پناہ میں ممکن ہے۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ | وہ شخص جس نے اپنا آپ اللہ کے لئے سونپ دیا اور وہ نیکوکار بھی ہے تو ایسے کو نہ کوئی خوف

وَلَا هُم يَحْزَنُونَ" (البقرہ پ ۱۳)	ا ہے اور نہ غم۔
وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا" (النساء پ ۵)	(تیرے فیصلہ کو) پوری طرح مان لیں۔

"سُلَّمٌ"۔ سیڑھی، زینہ، جو عروج اور ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاتِيَهُم بِآيَةٍ" (الانعام پ ۷)	یا سیڑھی لگا آسمان میں تاکہ اوپر سے ان کے لئے کوئی نشانی لے آئے۔

سلام:۔ اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہے۔

یہ تمام معانی اسلام کے مفہوم میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اصطلاحی مفہوم جیساکہ یہ لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے یہ ہے کہ تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے جن قوانین کے آگے جھکتی ہے۔ اور جن سے نظام کائنات قائم ہے اور جن کے تحت کائنات پر تغیرات ارتقائی واقع ہوتے ہیں۔ وہ "اسلام" ہے۔

"اَفَغَيْرَ دِينِ اللهِ يَبْغُونَ وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَاِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ... وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (پ ۳)	کیا دین اللہ کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے طوعاً (اور اکثر انسان) کرہاً اسی کے (قوانین فطرت کے) حضور سر تسلیم خم کرتے ہیں اور تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔۔۔ ..... اور جس نے اسلام کے غیر دین کا اتباع کیا تو

اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائیگا اور انجام کار خسارہ میں رہے گا۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام دین الفطرت ہے، کسی بشر کی اختراع نہیں۔

"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ	اپنی تمام تر توجہ سیدھی اس دین کے لئے یکسو ہو کر لگا جو اللہ کا (وضع کردہ) قانون پیدائش ہے جس پر انسان کی پیدائش واقع ہوئی ہے اللہ کا قانون فطرت کبھی

القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون" (الروم ع۴)	تبدیل نہیں ہوتا۔ یہ ہے دین استوار و دائمی۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔

یہ دین الفطرت کسی بشری شخصیت یا اس کی موت و حیات سے وابستہ نہیں ہے خواہ وہ بشر رسول یا نبی ہو، انسان پر اس دین یعنی قانون فطرت کا انکشاف ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً "نیوٹن" نے مسئلہ کشش ثقل دریافت کیا۔ "کیپلر" نے سیارگان کی رفتار میں ایک قانون معلوم کیا، نیوٹن اور کیپلر ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے کہ یہ قوانین آفرینش سے سرگرم عمل تھے اور وہ مر گئے اور یہ اسی طرح کارفرما ہیں۔ ارشاد قرآن ہے کہ :-

"وما محمد الا رسولٌ قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیه فلن یضر اللہ شیئاً، وسیجزی اللہ الشاکرین" (آل عمران ع۱۵)	اور محمدؐ تو صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے اور بھی رسول گذرے ہیں۔ اگر یہ طبعی موت سے مر جائے (جو یقینی امر ہے) یا مارا جائے (جس کا امکان ہے) تو کیا تم الٹے پاؤں (دین اللہ سے) پھر جاؤ گے اور جو بھی برگردان ہوگا۔ تو (دین) اللہ کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اور اللہ جلد ہی سے شکر گذار بندوں کو مناسب جزا عطا فرمائے گا۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دین الفطرت جس کو قرآن میں دین الحق اور دین اللہ سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کی بشری شخصیت سے وابستہ نہیں۔ آنحضرتؐ کی ولادت سے پیشتر بھی یہ دین موجود تھا اور آنحضرتؐ فوت ہو گئے تو اب بھی ہے۔ البتہ آنحضرتؐ پر یہ دین اپنی پوری شان میں واضح ہوا۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله وکفیٰ باللہ شهیدا (الفتح ع۴)	وہ اللہ ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین الحق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس پر دین کلہ منکشف ہو اور اس کے لئے اللہ کی شہادت کافی ہے۔

آنحضرتؐ سے پیشتر تمام انبیاء و رسل قومی تھے اور اپنی قوم سے باہر انہوں نے تبلیغ دین نہیں کی۔ یہ ازمنہ تاریک کی ایک خصوصیت تھی کہ قوموں کا پیوند ایک دوسرے سے جدا تھا۔ اس لئے ان پر دین الحق کا انکشاف اتنا ہی ہوا جتنا قومی ضروریات کے لئے کفایت کرتا تھا لیکن آنحضرتؐ "کافۃ الناس" کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے۔ "یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔" آنحضرتؐ نے اہل کتاب اور غیر اہل کتاب غرض سب کو مخاطب کیا۔ اس لئے آنحضرتؐ پر دین الحق کلہٗ منکشف ہوا۔

یہ حقیقت جس کا مذکور آیات محولا بالا میں ہے اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ اگرچہ آنحضرتؐ پر دین الحق کلہٗ منکشف ہوا اور اس لئے آنحضرتؐ کو تمام رسل پر بحیثیت رسول ایک گونہ فضیلت حاصل ہے "تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض" لیکن دین دین اللہ ہے اور کل کائنات کا دین الفطرت ہے کسی بشر کی اختراع نہیں۔ اس کو کسی بشری شخصیت سے وابستہ کرنا اس کو الوہیت کا درجہ دینا ہے۔ جیسے "مسیحیت" یہ اختراع پولوس کی ہے۔ اس لئے نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ مسیحؑ زندہ ہیں۔ مسیحؑ کو ان لوگوں نے اللہ حی القیوم کی طرح تصور کیا۔ اسی طرح ہر ایک مذہب جو کسی شخصیت سے وابستہ ہے اور اس کے نام سے موسوم ہے، محض شرک ہے۔ یہ اصل الاصول اسلام ہے۔ اسی طرح اگر تمام مذاہب پر نظر کی جائے جو قوموں میں رائج ہیں تو یا کسی قوم یا ملک یا کسی بشری شخصیت سے وابستہ ہیں۔ اور ان کی قومیت اور ملک اور شخصیت کے باہر معدوم ہیں۔ اس لئے قوموں نے ان کو زندہ رکھنے کے لئے ان کو الوہیت کا درجہ دیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ ایک رسول کو دوسرے پر فضیلت من وجہ ہے اور عنداللہ ہے مسلمانوں کو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ ان میں تفریق نہ کی جائے۔

"لا نفرق بین احد من رسلہ" (پ ۳)

اور ہم مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ تقوٰی کا تقاضہ ہے کہ یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک" (پ ۱)

چونکہ انبیاء و رسل آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور ایام جاہلیت کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ فہم انسانی بالغ نہ تھا اور قوموں میں باہمی رابطہ نہ تھا اور آنحضرتؐ کی بعثت پر قوموں میں میل جول معاشری و سیاسی وغیرہ شروع ہوگیا تھا اور تمام عالم انسانی میں وہ رابطہ پیدا ہونا تھا جو اب مشاہدہ ہو رہا ہے اور آئندہ توقع ہے کہ تعلقات اس حد تک مضبوط ہوں گے کہ قومی عصبیت مٹ جائے گی اس لئے ضرورت ایسے رسول کی تھی جو کافۃ الناس کی رہنمائی کرے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہر ایک نبی اور رسول اپنی اپنی قوم کی کرتا رہا۔ اس لئے یہ بھی ضرور تھا کہ جو بھی صداقت کتب مقدسہ سابقہ میں ہے اس کی تصدیق (VERIFICATION) بھی ہو تاکہ اقوام کو معلوم ہو کہ ان میں اور مسلمانوں میں کوئی مغائرت جہاں تک دین کا تعلق ہے، نہیں ہے۔ اور قرآن کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ قوموں میں اتحاد و یگانگت دین کی بنیاد پر قائم کی جائے۔ اس لئے یہود و نصارٰی کے تعصب کی مذمت فرماتا ہے کہ کتاب تو ایک ہی ہے جو دونوں پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر ایک دوسرے کو گمراہ کہتا ہے اور اہل کتاب کو دعوت دیتا ہے کہ "تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم" آؤ ہم ایک حقیقت پر جو ہم میں ثابت شدہ ہے اتفاق و اتحاد کریں اور یہ توحید ہے

عارف رومیؒ نے "لا نفرق بین احد" کی کیا اچھی تفسیر کی ہے کہ یہ سمجھو کہ تمام انبیاء و رسل ایک ہی قندیل کی بے شمار شمعیں ہیں جو ایک مکان کو روشن کر رہی ہیں۔ تم اس نور میں تفریق نہیں کر سکتے جو ان سے ضیاء پاشی کر

کر رہا ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ کس شمع کا نور ہے۔ خود آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ اگر تم میرے وصف بحیثیت رسول اور نبی بیان کرو تو احتیاط کرو کہ ایسے الفاظ استعمال نہ ہوں جن سے کسی رسول یا نبی کی توہین ہو۔ ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مدحیہ کلمات آنحضرتؐ کی نسبت کہے، فرمایا "ذالت ابراهیم" یہ تعریف ابراہیمؑ کی ہے۔

غرض اصل اصول اسلام توحید بلا شائبہ شرک ہے۔ اور جب کبھی اقوام عالم کا اتحاد بلکہ رابطہ اخوت قائم ہوگا۔ اسی اصل اصول پر ہوگا کہ سب بشر ہیں اور سب کا خدا ایک ہی اللہ ہے

انکشاف دین الحق

سوال یہ ہے کہ جن کو قرآن میں "رسول" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ان پر دین حق کا انکشاف کس طرح ہوا؟ اور اس کی حقانیت پر ناقابل تردید "برہان" کیا ہیں؟ قرآن تدکرو تدبّر و تفکر اور "وحی" کو ذریعہ کشف بتاتا ہے۔

"وکذلک نری ابراھیم ملکوت السموٰت والارض ولیکون من الموقنین" (الانعام ۷۵)	اور اس طرح ہم نے ابراہیم کو ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کرایا اور اس غرض کے لئے کہ وہ یقین لانے والوں میں سے ہو۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ اسلام دین الفطرت کل کائنات کا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اسی نظام کائنات کا مشاہدہ کیا اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ ایک پختہ نظام ہے اور تمام نظام شمسی بلکہ کل کائنات میں قوانین فطرت کارفرما ہیں جن کا وضع کرنے والا ایک ہی ہو سکتا ہے۔ سردست ہم اس بحث میں نہیں جاتے کہ عقیدہ توحید حضرت ابراہیمؑ نے کیسے اخذ کیا۔ اس کی تشریح مناسب مقام پر کی جائے گی۔ اس مقام پر اتنا ہی واضح کرنا

مقصود ہے کہ اسلام دین الفطرت ازلی وابدی کل کائنات کا ہے۔ جب یہ حقیقت رُسل پر واضح ہوئی تو اپنی اپنی قوم کو اس طرف توجہ دلائی۔

"بُرہان" پر ہمیں کچھ زیادہ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں کیونکہ کل حکماء کا اتفاق اس حقیقت پر ہے کہ قوانین فطرت کبھی ہرگز تبدیل و تحویل نہیں ہوتے۔ اس لئے "ذلک دین القیم" - یہ بالبداہت ثابت شدہ حقیقت ہے "آفتاب آمد دلیل آفتاب" اگر برہان ہی کا مطالعہ منظور ہو تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے حالات جیسے کہ قرآن میں مذکور ہیں پڑھو۔ اور قرآن عظیم تو یہی برہان پیش کرتا ہے۔

برہان | لفظ "برہان" کے معنی ہیں "حجت" یا دلیل جو لاجواب معقول اور واضح ہو۔ حسب ذیل آیات قرآنی میں یہ لفظ استعمال ہوا۔

(۱) "لا برھان لہ بہ" | (مشرکوں کے پاس شرک کی تائید میں) کوئی واضح دلیل نہیں۔

(۲) ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین" (پ۱/۱۳) | (یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ وہی جنت کے واحد اجارہ دار ہیں، یہ تو ان کی محض تمنا ہے، انہیں کہو کہ) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو معقول اور واضح دلیل پیش کرو۔

(۳) "لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون ام اتخذوا من دونہ آلھۃ قل ھاتوا برھانکم" (پ۱۷/۲) | اللہ جو چاہے کرے کوئی اسے پوچھنے والا نہیں اور وہ (غیر اللہ) اپنے اقوال و اعمال کے جوابدہ ہیں (یہ ایک محکم دلیل اللہ کی حکومت بلاشرکت غیر ہے کہو کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ) اللہ کے سوا اور بھی اس کے شریک ہیں تو اپنی دلیل پیش کرو۔

(۴) قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین" | (اللہ جو بھی پیدا کرتا ہے اس کی پیدائش کو دہراتا رہتا ہے اور یہ حقیقت عام مشاہدہ ہو رہی ہے اور اللہ ہی آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے اور یہ بھی مشاہدہ ہو رہا ہے ان امور میں اس کا کوئی شریک نہیں) ان

کو کہو کہ اگر تم اپنے دعویٰ شرک میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔

(۵) "قلنا ھاتوا برھانکم" (ب) | (ہم ہر ایک امت سے ایک ایک گواہ کھینچ لائیں گے اور یہ اسی امت کے انبیاء و رسل ہوں گے جو مشرکوں کو واضح دلائل کے ساتھ شرک سے منع کرتے رہے اور) ہم مشرکوں سے کہیں گے کہ اب تم اپنی دلائل پیش کرو (جو ثبوت شرک میں رکھتے ہو)

(۶) "لولا ان رّا برھان ربہ" (ب) | (اگر یوسف کو گمراہی سے بچانے کے لئے) اس کے پروردگار کی یہ دلیل پیش نظر نہ ہوتی (کہ اس کے آقا نے اس سے اچھا سلوک روا رکھا ہے اور اسے خیانت کا مرتکب نہ ہونا چاہیئے) تو وہ ضرور پھسل جاتا۔ جبکہ زوجہ عزیز اس کی خواستگار تھی۔

ان تمام آیات میں عقلی و نقلی و اخلاقی برہان ہی مراد ہیں۔ اہل کتاب یہود اور نصاریٰ سے ان کی اپنی کتاب توراۃ و انجیل سے نقلی برہان کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اور مشرکین سے عقلی دلائل کا اور حضرت یوسفؑ کو اعلیٰ اخلاقی دلیل کی سمجھ تھی۔ قرآن میں کسی آیت میں لفظ "برہان" کا مفہوم "معجزہ" نہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ ان سے برہان طلب کیا گیا۔

اس لئے ارشاد قرآن ہے کہ

(۷) "فذٰنک برھانٰن من ربک الیٰ فرعون و ملائہ" (ب)	یہ دو برہان (عصا و ید بیضا موسیٰ کو تیرے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے امراء و وزراء کو قائل کرنے کے لئے عطا ہوئے۔

اور یہی دو برہان آنحضرتؐ کو بھی عطا ہوئے۔

(۸) "یاایھاالناس قد جاءکم برھان | اے لوگو تحقیق تمہارے پاس پروردگار کی طرف

من ربکم وانزلنا الیکم نورا مبینا" (پ)	سے برہان (قرآن) آچکا ہے اور تمہاری طرف واضح روشنی (علم وحکمت) نازل کی گئی ہے۔
"قد جاءکم من اللہ نور وکتٰب مبین" (پ)	تحقیق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن آچکی ہے۔

معجزات حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اگر کوئی شخص عصا کا سانپ بنا کر دکھادے اور کہے کہ دو اور دو تین یا پانچ ہوتے ہیں تو گو ہمیں تعجب ضرور ہوگا کہ عصا سانپ کیسے بن گیا لیکن اس کا دعویٰ نامعقول اور قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ میں عصا کو سانپ بنا کر دکھاتا ہوں اور فرض کرو کہ اس نے دکھا بھی دیا تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کے دعویٰ اور دلیل میں کیا مناسبت ہے؟ کیا اللہ بھی عصا کا سانپ بنایا کرتا ہے؟ اور جب یہ امر سنت اللہ کے خلاف ہو تو ایسا مدعی رسالت محض شعبدہ پرداز ہے اور اگر یہ کوئی برہان ہو تو ہر ایک شعبدہ پرداز جو بھی کہے تسلیم کرنا پڑے گا، خواہ وہ سفید جھوٹ ہی ہو۔

پیشتر اس کے کہ ہم یہ واضح کریں کہ "برہان" کا ماخذ کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معجزات کی حقیقت بحوالہ آیات قرآن بیان کریں کیونکہ یہ بھی ایک اہم اصل اصول اسلام ہے۔

"ازمنہ تاریک" (DARK AGES) کو قرآن میں ایام "جاہلیت" یا "ظلمات" سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ ایام آنحضرتؐ کی بعثت اور نزول قرآن سے پیشتر عالم انسانی پر گذرے۔ ان ایام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ عام فہم انسانی بالغ نہ تھا اور مشاہدہ کائنات میں زیادہ تر "وہم وظن" کا دخل تھا۔ اُمم سامیہ میں تمام انبیاء و رسل اور امم آریہ میں رشی اور منی اور اوتار وغیرہ انہی ایام میں گذرے۔ جن کے ذہنی

درجات بلند تر تھے مگر توہمات اور تمناؤں سے ان کا ذہن بھی پاک نہ تھا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ ولا نبيٍ الا اذا تمنیٰ القی الشیطٰنُ فی اُمنیتہٖ، فینسخ اللہ ما یلقی الشیطٰن ثم یحکم اللہ آیتہ " (پ۱۷ ع۱۴)	تجھ سے پہلے نہ تو کوئی رسول اور نہ کوئی نبی ایسا گذرا ہے کہ اس نے تمنا (دور از کار توقعات) کیں تو شیطان نے اس کی آرزو میں دخل نہ دیا ہو تو (یہ تمنائیں کتب سابقہ میں موجود ہیں) اللہ اس شیطانی القاء کو منسوخ فرماتا ہے اور اپنی آیات (قرآن) محکم بناتا ہے (کفر گیر د کاملے ملت شود)

اہل کتاب یہ عقیدہ پختہ کر چکے تھے کہ انبیاء ورسل کی صداقت کا نشان معجزات ہیں اس لئے آنحضرت ؐ سے بھی بہت معجزات طلب کئے اور کہا کہ موسیٰ ؑ نے عصا کا سانپ بنا کر دکھایا۔ ایک ضربِ عصا سے بحر کو پھاڑا۔ پہاڑی سے بارہ چشمے بہا دئے ۔ اگر آپ بھی کوئی ایسا معجزہ دکھائیں تو ہم ایمان لائیں گے۔ حالانکہ بنی اسرائیل تمام عمر حضرت موسیٰ ؑ کو اذیت ہی دیتے رہے۔ اور توراۃ میں مذکور ہے کہ ہمیشہ سرکشی اور بغاوت پر آمادہ رہے۔ حضرت مسیح ؑ کے معجزات مسیحی دنیا بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتی مگر قوم کا کیا مذکور ہے۔ آپ کے حواری بھی کچھ ایسا پختہ ایمان نہ رکھتے تھے۔ ایک نے تیس روپیہ کے عوض گرفتار کرایا۔ اور جلیل القدر حواری پطرس نے برملا آپ کا انکار ہی نہ کیا بلکہ لعنت بھی کی۔ ایسے معجزات کا کیا فائدہ! حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ معجزات تھے تو ان کا ایمان کبھی متزلزل نہ ہوتا۔ تاریخی واقعات کی شہادت موجود ہے کہ جب انسان کوئی عقیدہ پختہ کر لیتا ہے خواہ غلط ہی ہو تو ایک انچ برابر نہیں ہٹتا خواہ جان پہ بن جائے۔ ایک انصاف پسند مسیحی (ARBUTHNOT.) لکھتا ہے کہ " محمد ؐ کے اصحاب کی مثال مسیح ؑ کے حواریوں میں نہیں ملتی، حالانکہ اول الذکر نے کوئی معجزہ

نہیں دکھایا اور انجیل تو معجزات ہی کا بیان ہے۔

آنحضرت ؐ سے اہل کتاب کہتے کہ ایسا معجزہ دکھاؤ کہ لہلہاتا باغ ہو اور اس میں نہریں جاری ہوں۔ اس میں ایک سونے کا محل بھی ہو یا سیڑھی لگا کر ہمارے سامنے آسمان پر خالی ہاتھ چڑھ جاؤ اور وہاں سے ایک آسمانی کتاب لاؤ جسے ہم چھو کر اچھی طرح تسلی کر لیں۔ ان فرمائشی معجزات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہے کہ باغ اور نہریں اور محل اور سونا اور سیڑھی اور آسمان اور کتاب سب ممکنات کے تصورات ہیں اور "علم النفس" کے عالم جانتے ہیں کہ ناممکن اور محال کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا ان جہلا نے اس میں یہ بات پیدا کی ہے کہ یہ سب کچھ یک لخت بلا خارجی اسباب پیدا ہو جاتے۔ ممکنات کا تصور تو اپنے ذہن سے محو نہیں کر سکتے۔ اور اپنے زعم ناقص میں وہ بات طلب کرتے ہیں جو ناممکن ہے۔

ارشاد قرآن ہے کہ:۔

واقسموا بالله جهد ایمانهم لئن جآءتهم آیة لیؤمنن بها قل انما الآیت عند الله وما یشعرکم انها اذا جآءت لا یؤمنون ونقلب افئدتهم وابصارهم کما لم یؤمنوا به اول مرة ونذرهم فی طغیانهم یعمهون ولو اننا نزلنا الیهم الملئکة وکلمهم الموتی وحشرنا علیهم کل شئ قبلا ما کانوا لیؤمنوا الا ان یشاء الله ولکن اکثرهم یجهلون۔ (پ۷ ۱۹، پ۸ ۱)

اور اللہ کی سخت ترین قسمیں کھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی معجزہ دکھایا جائے تو اس کے مشاہدہ پر ایمان لائیں گے۔ ان کو جواب دو کہ معجزات تو اللہ ہی کے ہاں ہیں (میں تو ایک بشر رسول ہوں) اور تمہیں کیا معلوم کہ جب کوئی (فرمائشی) معجزہ دیکھ بھی لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں گے (کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے) اور ہم ان کے دلوں اور نظروں کو الٹ دیں گے۔ جس طرح (ہوش و حواس کے ہوتے) پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اسی طرح جب (یہ مختل یا معطل ہو جائیں) پھر بھی ایمان نہ لائیں گے۔ اور ہم

ان کو ان کے طوفان بے تمیزی میں چھوڑ دیں گے (ان کے فرمائشی معجزات سے بڑھ کر) اگر ہم ان کی طرف ملائکہ بھی نازل کریں اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور ہر ایک شے کا حشر ان کے روبرو ہوتا پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر جسے اللہ چاہے ہدایت دے (وہ ان کے بغیر بھی ایمان لاتا ہے) بات یہ ہے کہ ان میں اکثر جاہل ہیں۔

قرآن حکیم نے ان آیات میں معجزات کی حقیقت کھول رکھ دی ہے۔ انما الآیت عند اللہ۔ کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے معجزہ ہے اور "حق" ہے کائنات کے ذرہ ذرہ میں وہ امکانات پوشیدہ ہیں جنہیں قرآن میں "الغیب" سے تعبیر کیا گیا ہے اہل عقل و فکر ہی پر ان کا انکشاف ہوتا ہے ہمارے زمانہ میں اہل علم و حکمت نے صحیفہ فطرت یا کتاب کائنات سے وہ بات پیدا کی ہے کہ ایام جاہلیت کے ذہن میں اس کا تصور بھی نہ تھا۔ ان کے سامنے ان کے فرمائشی معجزات ہیچ ہیں۔ انسان تو ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ پیدا کرنا تو بڑی بات ہے، معدوم بھی نہیں کر سکتا۔

ان آیات میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ان جاہلوں کے فرمائشی معجزے ایسی بات نہیں جو ہم دکھا نہیں سکتے۔ یہ روزمرہ خواب اور سراب اور بحالت دیوانگی دیکھتے ہیں۔ جب ان کے حواس معطل اور مختل ہوتے ہیں۔ ہوش و حواس اور عقل و فکر کے ہوتے تو وہ حقیقی معجزات کا انکار کرتے ہیں اور مانگتے کیا ہیں، خواب غفلت شراب کے نظارے یا دیوانگی۔

اہل کتاب کہہ سکتے ہیں کہ قرآن توراۃ و انجیل و صحف انبیاء کا مصدق ہے اور ان کتب مقدسہ میں عصا و ید بیضا اور دیگر معجزات کا مذکور ہے۔ اور خود مسلمان بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن میں یہ معجزات مذکور ہیں اور ان کی نفی نہیں کی گئی۔ اس لئے معجزات جو انبیاء سے منسوب ہیں، حق ہیں ان پر ایمان لانا چاہیئے۔ "حق" کو

تسلیم کرنا اہم اصل اصول ہیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم معجزات مبینہ کو اس معیار پر پرکھیں جو حق و باطل میں امتیاز کا ہے۔

حق و باطل حق و باطل میں اضداد ہیں۔ باطل کا مفہوم "عدم" نہیں ہے، عدم کا تصوّر تو انسانی ذہن میں ممکن ہی نہیں ہے۔ باطل سے مراد وہ ظنّیات یا اعمال ہیں جو عبث اور بے نتیجہ ہوں، اہل ذکر و فکر جب کائنات میں نظر کرتے ہیں تو مشاہدہ کے بعد اس صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "ربنا ما خلقت ھذا باطلا" یعنی کائنات میں فطرت کا کوئی عمل بے نتیجہ اور عبث نہیں ہوتا۔ حق و باطل کی جامع تعریف یہ ہے کہ:-

قل ان ربی یقذف بالحق، علاّم الغیوب، قل جاء الحق و مایُبدئُ الباطل و مایُعید۔ (۲۲/۱۲)	کہو کہ میرا پروردگار جو تمام پوشیدہ امور کا خوب جاننے والا ہے۔ حق کو نازل فرماتا ہے۔ کہو کہ حق آگیا۔ اور باطل نہ تو کچھ پہلی بار پیدا کرتا ہے اور نہ پیدائش کو دُہراتا ہے۔

لفظ "بدا" کے جس سے "یبدی" مشتق ہے یہ معنی ہیں کہ کسی شے کے پوشیدہ خواص اور حقایق کو ظاہر کرنا، اسی سے لفظ "ابتدا" ماخوذ ہے۔ یعنی کسی شے کا آغاز، مثلاً انسان کی پیدائش کا آغاز "طین" سے ہوا۔ جو طبقہ جمادات میں ہے۔ انسان تو موجود نہ تھا مگر "طین" میں ایک پوشیدہ حقیقت ممکنہ تھی جو ارتقائی مرحلے طے کرتی ہوئی انسان کی صورت میں رونما ہوئی۔ لفظ "بدا" قرآن میں "خفی" اور "عود" کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ "خفی" تو یہی کہ کسی شے کے پوشیدہ حقایق ظاہر ہوں۔ اور "عود" یہ کہ ان حقایق کا اظہار بار بار ہو۔ چنانچہ انسان سے انسان پیدا ہوتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ارتقا بھی ہے۔ یعنی پیدائش سے ایک نئی پیدائش کا ظہور ہو رہا ہے۔ یہ تو ہے "حق" اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس کے خلاف

باطل ہے کہ اس سے نہ حقایق کا ظہور ہوتا ہے اور نہ کوئی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اس معیار پر اگر معجزات کو پرکھا جائے تو وہ عبث ہی ثابت ہوں گے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہئیے کہ انبیاء کے ذہنی درجات اپنے زمانہ کے عام فہم سے اعلیٰ وارفع ہوتے ہیں اور ان حقایق سے آگاہ ہوتے ہیں جو عوام کے لئے "الغیب" ہوتے ہیں۔ اور اس "الغیب" کا اظہار ان پر محض تجربہ اور مشاہدہ سے نہیں ہوتا بلکہ ایک اور شے بھی ہے جس کو لسان مذہب میں "وحی" کہتے ہیں۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور سردست ہماری بحث سے خارج ہے۔ لیکن جب اس کا اظہار وحیاً ہوتا ہے تو اس کی تصدیق عقلاً بھی ہوتی ہے اور یہ تو حکماء بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ "ناممکن" کوئی شے نہیں، اور ناممکن کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ جسے ناممکن کہتے ہیں وہ یا اس کے تمام اجزاء ممکنات کا ہی تصور ہوتے ہیں۔ مثلاً سونے کا محل، سونا اور محل دونوں ممکنات ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ ایسے سونے کا محل کھڑا کیا جائے جو یک لخت بلا اسباب نظر آئے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایسے نظارے ہم خواب یا سراب یا دیوانگی میں دیکھتے ہیں۔ جب ہمارے حواس مختل یا معطل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ یہ بھی دکھا سکتا ہے اور اگر لوگ دیکھیں تو یہی کہیں گے کہ "ھذا سحر مبین"۔ تو ایسے معجزات کا کیا فائدہ، اور جو ایمان ایسے معجزات پر لایا جائے۔ اس کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اب فرض کرو کہ ایسے معجزات انبیاء نے دکھائے۔ کیا فرعون اور آل فرعون ایمان لائے؟ کیا یہودی مسیحؑ پر ایمان لائے۔ اور اگر توراۃ اور قرآن کی شہادت پر اعتبار کیا جائے تو واضح ہوگا کہ بنی اسرائیل ہمیشہ حضرت موسیٰؑ کو اذیت ہی دیتے رہے اور مسیحؑ سے جو سلوک کیا وہ تو تاریخی واقعات ہیں۔

چونکہ قرآن میں یہ آیات جو کتب مقدسہ سابقہ کی ہیں، متشابہات کی ذیل

میں آئی ہیں اور تاویل کی محتاج ہیں اور تاویل اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اِس لئے ہمیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ "کل من عند ربنا (۷/۳) اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تاویل قرآن میں محکمات سے فرماتا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر علیحدہ بحث کی ہے اس لئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہمیں قرآن حکیم کی آیات محکمات کو مشعل راہ سمجھنا چاہیئے اور بس۔ کوئی امر ناممکن نہیں۔ صرف علم کی کمی کی وجہ سے ہم ناممکن کہتے ہیں۔ جوں جوں ذہنی ارتقا کے ساتھ ہمارا علم وسیع ہو رہا ہے، ہر ایک امر جس کو ناممکن تصور کیا جاتا تھا ہمارے دائرہ علم میں آ رہا ہے۔ محال اندیش صرف "وہم" ہے مگر جیسے وہ محال دکھاتا ہے۔ خارجی اسباب کے ساتھ ممکن ہو جاتا ہے۔ ہمیں اسباب کا علم ہونا چاہیئے۔ ذہن انسانی ترقی کر رہا ہے اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ابھی کیا کچھ ظہور میں آنے والا ہے۔ اللہ کی پیدا کردہ کائنات سچ مچ معجزہ ہے۔ اس کا منکر کافر ہے۔

محکمات

متشابہات کے تحت احکام بھی آتے ہیں یہ ایک مستقل موضوع ہے اور ہم نے اپنی تصنیفات میں اس پر مفصل بحث کی ہے کہ قرآن کتاب احکام نہیں ہے جیسی کہ توراۃ ہے لیکن جامع و مانع کتاب اصول احکام ہے۔ احکام کا وضع کرنا سکھاتا ہے جن کا وضع کرنا "شوریٰ" پر چھوڑ دیا، کہ ذہنی اور خارجی حالات کے مناسب ان اصول کے تحت جو قرآن میں مذکور ہیں "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کریں۔ ایام جاہلیت میں یہ کام انبیاء کا تھا۔

محکمات وہ اصول ہیں جو فطری ہیں اور تحویل و تبدیل نہیں ہوتے۔ متشابہات میں رد و بدل بہ تقاضائے حالات خارجی ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے توراۃ کے احکام انبیاء جو حضرت موسیٰؑ کے بعد مبعوث ہوئے ترمیم کرتے رہے اور حضرت مسیحؑ نے

توسبت کا احترام بھی اٹھا دیا تھا۔ لوگ جو وقتی احکام کو بھی اصولی سمجھتے تھے مخالف ہو گئے۔ کوئی کتاب ایسے احکام کی جامع نہیں ہو سکتی جو تمام حالات خارجی کے مناسب ہوں۔ حالات ہمیشہ بدلتے ہیں اور غیر محدود ہیں۔ صرف ان اشیا کی ایک جامع فہرست مرتب نہیں ہو سکتی۔ جو کسی ایک طبقہ جمادات یا نباتات یا حیوانات میں حلال یا حرام ہیں۔ قرآن نے اصول حلال و حرام بتا دیا کہ طیب شے حلال اور خبائث حرام ہیں۔ اور خبائث وہ ہیں جن پر "رجس" اور "فسق" کا اطلاق ہو اور ان اصول کی تشریح چند مثالوں سے بھی کر دی۔

یہ "محکمات" آیات ہیں صحیفہ فطرت[1] کی۔ اس لئے یہ اصول موضوعہ نہیں بلکہ متعارفہ ہیں۔ قرآن تفصیل اور بیان کتاب کائنات ہے۔ قرآن کے معنی ہیں "پڑھنا" پڑھنا کسی کتاب ہی کا ہوتا ہے اور یہ کتاب ناطق ہے

"ولدینا کتٰب[2] ینطق بالحق" (پ۱۸) | اور ہمارے پاس حق بات بولنے والی کتاب ہے

ہمہ عالم کتاب حق تعالیٰ است
ہر آں کو را کہ جانش در تجلی است

قرآن عظیم انہی محکمات یا آیات صحیفہ فطرت کا بیان ہے اس لئے تمام محکم کتاب ہے۔ "یٰسین والقرآن الحکیم" (قسم ہے قرآن محکم کی) اس کی ہر ایک سورت محکم ہے "فاذا انزلت سورۃ محکمۃ" (پ۲۶) اس کی ہر ایک آیت محکم ہے۔ "احکم اللہ ایٰتہ" (پ۱۷) لفظاً اور معناً اس میں اختلاف ممتنع ہے۔ اس کی ہر ایک آیت اور آیت کا ہر ایک لفظ محفوظ اور محکم ہے۔ اس کا اسلوب بیان اور آیات کا موقع و محل

---

[1] اصل کتاب حق تعالےٰ تو یہی کتابِ فطرت ہے لیکن تورات و انجیل و قرآن بھی کتب ہیں۔ قرآن تو کتاب کائنات کا بیان اور تفصیل اور کلید ہدایت ہے۔

[2] عارف رومیؒ کہتا ہے:۔ نطق آب و نطق باد و نطق گل ؛ ہست محسوس حواس اہل دل
اگر آب و بادہ و خاک و آتش اہل علم و حکمت سے ہمکلام نہ ہوتی تو ان کے حقائق کا علم ہمیں کیسے ہوتا۔

بالکل کتاب کائنات کی طرح ہے۔ بادی النظر میں کائنات کی مختلف اشیاء بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں۔ کرۂ ارض پر دریا ہے تو کہیں پہاڑ، کہیں میدان اور میدان میں جھیل کہیں ریگستان اور بے آب وگیا میدان، کہیں سرسبز وادیاں اور پانی کی کثرت وغیرہ لیکن اہل علم وحکمت جانتے ہیں کہ کائنات میں ہر ایک شے کا صحیح مقام وہی ہے جہاں وہ مشاہدہ ہوتی ہے اور من وعن ہو بہو اس کا عکس تاحد نظر ہر ایک انسان کے قلب پر پڑتا ہے۔ اور اگر ہم اس ذہنی نقشہ کا خاکہ اس طرح کھینچنا چاہیں جیسا کہ وہ ہمارے قلب میں نازل ہو چکا ہے تو اسی طرح کریں گے جیسا کہ خارج میں موجود ہے ہمارے ذہن اور خارجی محسوسات میں عین مطابقت وہی ہے جسے ہم "حق" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا شعور "علم" سے موسوم ہے۔

اہل علم وحکمت سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ حقایق اشیا اگر باطل ہوں تو ہمارے تمام علوم وفنون باطل ہیں جو انہی حقایق کا بیان ہیں اور انہی سے ہماری مادی اور مذہبی ترقی وابستہ ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کائنات باطل ہے تو اس کا قول بھی باطل ہے۔

"از باطل سخن حق کہ باور دارد"

ہوا ہر ایک جگہ ہوا ہے۔ پانی ہر ایک جگہ پانی ہے۔ آگ ہر ایک جگہ آگ ہے، خاک ہر ایک جگہ خاک ہے۔ یہ حقائق خواہ کسی نام سے موسوم ہوں بدل نہیں سکتے۔ حقایق ہمارے ناموں اور ہماری شخصیت سے بے نیاز ہیں۔ اگر پانی کے حقایق کو کوئی شخص آگ کے حقایق بتائے تو "از حواس خویشتن بیگانہ است" اگر وہ پیاسا ہو تو اسے آگ کھلا دو اگر اپنی روٹی چولھے پر پکا رہے ہو تو چولھے میں پانی ڈال دو۔ اس کے حواس خمسہ خود بخود درست ہو جائیں گے۔

امید ہے کہ اس تشریح کے بعد محکمات یا اصول کا فہم بخوبی ذہن نشین ہو گیا ہو گا

ایمان باللہ

ارشاد قرآن ہے

"لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر والملئکۃ والکتب والنبیین وآتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوۃ وآتی الزکوۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصبرین فی الباساء والضراء وحین الباس اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون" (پ۲)

یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر دیا مغرب کی طرف لیکن نیکی یہ ہے کہ اللہ اور یوم آخر اور ملائکہ اور الکتاب اور نبیوں پر ایمان لاؤ اور جو اپنا مال حسب توفیق قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور بے خانماں خانہ بدوش مسافروں اور سوالیوں اور ان کو جن کی گردنیں قرض وغیرہ سے بندھی ہوئی ہیں دیتے ہیں اور صلوۃ قائم رکھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جب عہد باندھتے ہیں تو اسے وفا کرتے ہیں اور جو فقر و فاقہ اور مصیبت میں اور لڑائی کے وقت صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہیں دیتے یہ لوگ حق پسند حق گو ہیں۔ اور یہی متقی راستباز لوگ ہیں۔

ان آیات کا پہلا حصہ جو ایمان باللہ والیوم الآخر والملئکۃ والکتب والنبیین کی بابت ہے اصول ہیں۔ اس کے بعد کی آیات کا تعلق اعمال سے ہے جو سر دست ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل الاصول ایمان باللہ ہے باقی امور پر ایمان بالتبع ہے۔ اس لئے یہی ہماری بحث کا موضوع دراصل ہے اگر کسی شخص کا اللہ پر ایمان نہ ہو تو اول تو یوم آخرت وغیرہ کا بھی منکر ہوگا اور اگر کسی رنگ میں تسلیم بھی کرتا ہو تو اس کا تصور ان امور کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتا۔ ماننے کو تو لوگ بالخصوص اہل کتاب بھی اللہ کو مانتے ہیں اور غیر اہل کتاب بھی کسی رنگ میں تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ہستی ایسی ضرور موجود ہے مگر بلا شرک

ایمان باللہ ان کے ذہن میں صاف صاف اور ممیز نہیں۔ مشرکوں کی صنمیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رب الارباب ہے جس کو امم آریہ کی زبانوں میں "دیو" دیوس (DEOS) یا ضیاء (ZEUS) وغیرہ الفاظ یا ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں اگر لفظ "گوڈ" (GOD) ہے تو اس سے مراد ہر ایک دیوتا ہے اور یہ لفظ بصیغہ جمع استعمال کرتے ہیں اور ان دیوتاؤں کا سلسلہ نسب بھی مرتب کر رکھا ہے یہ دیوتا دو قسم کے ہیں ایک نورانی اور دوسرے ظلمانی، ان کو "جن" کہتے ہیں اور اول الذکر کو ملائکہ، پرم آتما یا رب الارباب کے یہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ارشاد قرآن ہے کہ:۔

"وجعلوا للہ شرکاء الجن وخلقھم وخرقوا لہٗ بنین وبنٰت بغیر علم سبحٰنہ وتعالٰی عمّا یصفون بدیع السمٰوٰت والارض انّٰی یکون لہٗ ولدٌ ولم تکن لہٗ صاحبۃ وخلق کلّ شیءٍ وھو بکلّ شیءٍ علیم ذٰلکم اللہ ربکم لا الٰہ الّا ھو خالق کل شیءٍ فاعبدوہ وھو علٰی کل شیءٍ وکیل، لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا وما

اور اللہ کے شریک جن بنا رکھے ہیں اور اس کے لئے (دیو) بیٹے اور (ملائکہ) بیٹیاں تجویز کی ہیں۔ وہ ذات اس سے پاک ہے اور ارفع و اعلیٰ ہے اس وصف سے جو اس سے منسوب کرتے ہیں۔ آسمانوں اور زمین کو اسی نے پیدا کیا۔ اس کی اولاد کیسے ہو سکتی ہے جب اس کی کوئی رفیقہ حیات نہیں۔ اس نے ہر ایک شے پیدا کی ہے اور ہر ایک شے کا اسے دائمی علم ہے وہ ہے عظمت والا تمہارا پروردگار اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں ہے۔ ہر ایک شے کا خالق ہے اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر ایک شے کا کارساز مطلق ہے اس کا ادراک نظریں نہیں کر سکتی اور وہ نظروں کا ادراک کرتا ہے اور وہ لطیف خبردار دائمی ہے۔ تحقیق تمہارے پاس بصائر تمہارے پروردگار کی طرف سے

انا علیکم بحفیظ" (پ ۱۱ ع ۱۹) آ چکے ہیں تو جس نے مشاہدہ کیا تو اس کا فائدہ اسی کیلئے ہے اور جو آنکھیں رکھتا ہوا اندھا ہو تو وبال اسی پر (ان کو کہو کہ) میں تم پر حفیظ نہیں ہوں۔

ہم مشرکانہ عقائد کو نظر انداز کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن اللہ کی نسبت کیا بیان کرتا ہے یہ جو اہل کتاب اور مشرک کہتے ہیں کہ اللہ صاحب اولاد ہے اس کا جواب کئی طرح سے دیا گیا ہے۔ ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے جب اس کی کوئی رفیقہ ہی نہیں تو اولاد کیسی ہو گی۔ یہ اشارہ قانون پیدائش کی طرف ہے۔ مریم صدیقہ نے بھی ربی ذکریا کو یہی کہا تھا کہ جب آج تک مجھے کسی مرد نے چھوا ہی نہیں، تو میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا۔ مسیحی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کی کوئی زوجہ نہیں۔ اصنام پرست کہتے ہیں کہ زوجہ ہے اور چند دیویوں کا نام بھی لیتے ہیں۔ لیکن "صاحبۃ" کا مفہوم یہ ہے کہ رفیقہ ایسی ہونی چاہیئے جو ان کے مہادیو کی طرح پیدا شدہ نہ ہو نہ کہ اسی کی بیٹیاں ہوں اور بیٹی کا ہونا ممکن نہیں جب تک رفیقہ نہ ہو۔ بیٹی تو ماں باپ کے صغریٰ و کبریٰ کا نتیجہ ہے۔ جب ان میں سے ایک نہ ہو تو نتیجہ باطل ہے۔ ان آیات میں یہ حقیقت بطور اصول واضح کی گئی ہے کہ اللہ ہر ایک شے کا خالق ہے اور اس کا رب بھی ہے۔ کسی شے کو رفیقہ بنائے تو ضرور ہے کہ اس کو مساوی درجہ بھی دے بلکہ یہ مساوی درجہ اس کو بطور ہنر ذات حاصل ہونا چاہیئے اور یہ باطل ہے۔ اس لئے کہ ضرور ہے کہ میاں بیوی ایک جنس سے ہوں اور اس لئے ایک دوسرے کی مثل ہوں۔ اگر یہ صورت ہو تو وہ دونوں کسی اور کے بیٹے اور بیٹی ہوں گے اور یہ بھی باطل ہے۔

ملائکہ کی نسبت مشرکین کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں ارشاد ہے کہ

وجعلوا لہ من عبادہ جزءا	اور حق تعالیٰ کے بندوں میں سے ان کو اللہ کا جزء وا ولاد
ان الانسان لکفور مبین ام اتخذ	شریک، مقرر کرتے ہیں، تحقیق انسان انتہائی کفر کرتا ہے

مما یخلق بنت واصفٰکم بالبنین، واذا بشر احدھم بما ضرب للرحمٰن مثلاً ظل وجھہ مسودا وھو کظیم، او من ینشؤا فی الحلیۃ وھو فی الخصام غیر مبین، وجعلوا الملٰئکۃ الذین ھم عبد الرحمٰن اناثا، اشھدوا خلقھم' (پ۲۵)

کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی ہی مخلوق کو بیٹیاں منتخب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا اور حالت یہ ہے کہ جن کی مثال خدا پر عاید کرتے ہیں، اگر ان میں سے کسی کو اس کی ولادت کی خوش خبری دی جائے تو مارے غم و غصہ کے اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے (ان کے لئے تو بیٹے پسندیدہ ہیں اور اللہ کے لئے بیٹیاں، یہ تو نہایت ہی نامناسب تقسیم ہے) جو زیوروں میں پرورش پاتی ہیں اور بوقت خصومت دب کر رہ جاتی ہیں اور فرشتوں کو جو رحمان کے بندے ہیں فرقہ اناث میں مقرر کرتے ہیں۔ کیا ان کی پیدائش کے وقت یہ دیکھ رہے تھے۔

ایمان باللہ میں شرک و کفر کا شائبہ تک ممتنع ہے جو لوگ کفر و شرک میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کے ذہن میں خدا کا خیال اور ایمان کا تصور صاف صاف ممیز نہیں۔

از ہر چہ بگفتند از کم و بیش نشانے دادہ انداز دیدۂ خویش
منزہ ذاتش از چند و چہ و چون تعالیٰ شانہ عما یقولون

"لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار" اس کی تفسیر سورہ نور میں کی گئی ہے کہ "اللہ نور السمٰوات والارض"۔ نور خود روشن ہوتا ہے اور دیگر اشیاء کو روشن کرتا ہے۔ ایک تاریک مکان میں ہر ایک شے پر تاریکی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ نور شمع سے مکان اور اس کی ہر ایک شے دکھائی دینے لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نور شمع نے جو خود روشن ہے ہر ایک شے کو روشن کر دیا۔ ان اشیاء پر نور چھایا ہوا ہے۔ لیکن چونکہ وہ بہت لطیف شے ہے ہم اس کو تو نہیں دیکھتے اشیاء کو دیکھتے ہیں۔ یہی کیفیت

کائنات اور کائنات کی ہر ایک شے کی ہے کہ وہ بذاتہ تاریک ہیں لیکن جو نور ان کو روشن کر رہا ہے ہمیں اس کا احساس نہیں اور یہ سمجھتے ہیں جہان بذاتہ روشن ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری بصر و بصارت میں روشنی بھی اسی نور کی وجہ سے ہے ۔ جو کچھ بھی ہمیں محسوس ہوتا ہے اور ہمارے مشاہدہ اور علم و شعور میں آرہا ہے ۔ اسی نور کی وجہ سے ہے ۔ اس لئے اس کائنات کی گتھی سلجھ نہیں سکتی جب تک اللہ کی طرف ہمارا رجوع نہ ہو ۔ "و للہ ما فی السمٰوات و ما فی الارض و الی اللہ ترجع الامور" (پ۴) اور تمام امور اللہ کی طرف راجع ہیں اس لئے کہ جو کچھ سمٰوات و الارض میں ہے اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے ان کی ابتدا اور انتہا غرض سب کچھ اللہ ہی کا بنایا ہوا ہے اور سب کچھ وہی ہمیں مشاہدہ کراتا ہے ۔ "و للہ عاقبۃ الامور" (پ۱۷) "و الی اللہ عاقبۃ الامور" (پ۲۱) اس لئے اصل الاصول ایمان باللہ ہے ۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ "اصول" میں کوئی اختلاف نہیں ہے ایک درخت کے پتوں اور شاخوں اور پھلوں میں جو اصل کی فروع ہیں اختلاف شکل و صورت وغیرہ میں ہے ۔ اس لئے اختلاف ہمیشہ فروع میں مشاہدہ ہوتا ہے جب ہم "اصل" کو نظر انداز کر دیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ فروع ہی اصل ہیں اور "اصل" میں اختلاف ہے یہی وجہ ہے کہ قوموں میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ فروع کو اصل تصور کرتی ہے لیکن اگر اصل کی طرف رجوع ہو اور ہم فروع کی حقیقت سمجھ لیں ۔ تو اختلاف جو بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے مٹ جائے گا ۔ اسی حقیقت کی طرف قرآنی آیات کا اشارہ ہے کہ یہ اختلاف جس پر لوگ لڑتے جھگڑتے ہیں جب بھی اللہ کی طرف رجوع کریں گے مٹ جائے گا ۔ یعنی ان پر حقیقت منکشف ہو جائے گی ۔ یہ قیام بالحق ہے ۔ "ولیبینن لکم یوم القیٰمۃ ما کنتم فیہ تختلفون

ولوشاء الله لجعلکم امۃ واحدۃ (۴۸/۱۹)

"اصل" ایک ہی ہے، ایک سے زیادہ اصل ہو تو ان میں اختلاف واجب ہے ارشاد قرآن ہے کہ

"لوکان فیھا الھۃ الا اللہ لفسدتا، فسبحٰن اللہ رب العرش عما یصفون، لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون، ام اتخذوا من دونہ الھۃ، قل ھاتوا برھانکم، ھذا ذکر من معی وذکر من قبلی، بل اکثرھم لا یعلمون الحق فھم معرضون (۲۱/۲۴)"	اگر آسمانوں اور زمین میں ایک اللہ کے سوا اور بھی اللہ ہوتے تو دونوں آسمانوں اور زمین کا نظام بگڑ جاتا۔ اللہ رب العرش کی نسبت جو شرک منسوب کرتے ہیں وہ اس سے پاک ہے۔ جو کچھ چاہے کرتا ہے کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں اور یہ اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں۔ کیا (اس واضح دلیل کے ہوتے) انہوں نے اور معبود مقرر کئے ہوئے ہیں۔ انہیں کہو کہ (اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو) برہان پیش کرو۔ یہی بات جو میں کہہ

رہا ہوں وہ بھی کہتے ہیں جو میرے ساتھ میرے ہم خیال ہیں اور جو مجھ سے پہلے گذرے (انبیاء و رسل) یہی بات وہ بھی کہتے رہے، بات اصل میں یہ ہے کہ ان میں سے اکثر اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں اور جب ان کو سچی بات بتائی جاتی ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں۔

کوئی شے خواہ نفس الامر میں موجود ہو جب تک ہمیں اس کا احساس نہ ہو اور ہم پر منکشف نہ ہو ہمیں اس کا علم و شعور نہیں ہوتا۔ ہم کسی شے کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ ہمیں اس کا علم نہیں اس لئے وہ موجود ہی نہیں۔ عدم علم العلم عدم کے ہم معنی نہیں ہے۔ ہم کسی شے کی نسبت جس کی موجودگی کا ہمیں علم و شعور ہے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کا ہمیں کلیہ علم ہے۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی

چاہئیے کہ ہمیں ایک ذرہ کا بھی پورا کما حقہٗ علم نہیں۔ اس کے حقائق کا انکشاف ذہنی ارتقاءات کے مناسب ہو رہا ہے۔ اس لئے جہاں تک ہمارے علم و شعور کا تعلق ہے ہر ایک شے جس حد تک ہمارے دائرہ علم و شعور میں آچکی ہے محدود ہے اور جو اس دائرہ سے باہر ہے غیر محدود بھی ہے۔ بہرحال ہمیں کسی شے کی معرفت ممکن نہیں جب تک وہ ہمارے دائرہ علم و شعور میں نہ آئے اور یہ ممکن نہیں جب تک اسے مشخص اور معین نہ کریں اور تشخیص اور تعین اسماء و صفات سے کرتے ہیں۔ ارشاد قرآن ہے کہ

وتلک الامثال نضربها للناس لعلهم یتفکرون، هو الله الذی لا اله الا هو علم الغیب و الشهادة هو الرحمن الرحیم هو الذی لا اله الا هو الملک القدوس السلام المؤمن المهیمن العزیز الجبار المتکبر سبحٰن الله عما یشرکون هو الله الخالق الباری المصور له الاسماء الحسنیٰ۔ (پ ۲۸)

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ فکر سے کام لیں۔ اللہ وہی ہے جس کے سوا اور کوئی اللہ نہیں وہ ہر ایک پوشیدہ اور ظاہر کا عالم ہے اور وہی رحمان و رحیم ہے۔ وہی اللہ جس کے سوا اور کوئی اللہ نہیں۔ اسی کی واحد بلا شرکت غیر تمام کائنات پر حکومت ہے۔ ہر ایک نقص و عیب سے پاک ذات ہے اور اپنی ذات میں کامل ہے۔ امن دینے والا اور نگہبان غالب اور زبردست تکبر کرنے والا۔ پاک ہے اس چیز سے جو شریک ٹھہراتے ہیں۔ خالق اور درست کرنے والا اور مصور اس کے تمام اچھے نام ہی ہیں۔

یہ تمام اسماء مثالاً بیان کئے گئے ہیں غرض یہ ہے کہ ہم تفکر سے اصل حقیقت دریافت کریں۔ اسماء تو اشیاء میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ اور جب ہم وہ اشیاء میں امتیاز پیدا کرتے ہیں کہ ان میں مماثلت اور مشابہت اور تخالف اور تضاد کس حد تک ہے اور اگر ان میں "عینیت" ہو یعنی دونوں ہر ایک

زمان ومکان میں بالکل ایک جیسی ہوں تو وہ شے واحد ہے لیکن "لیس کمثلہ شئی وھو السمیع البصیر" (۲۵) اللہ کسی شے کی مثل نہیں اور وہ سمیع وبصیر ہے۔

جب اللہ کی نہ کوئی مثل ہے اور نہ ضد ہے تو ظاہر ہے کہ ہم اس کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے لیکن جب یہ کہیں گے کہ وہ سمیع وبصیر ہے تو یہ جانتے ہوئے کہ وہ کسی شے کی مثل نہیں ایک کیفیت ہمارے ذہن میں اس کی ہستی کے بارہ میں پیدا ہو جائے گی۔ فہم وتفہیم کے لیئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اللہ اسماء وصفت سے مشخص ہو۔ اگرچہ وہ اپنی ذات میں تشخیص اور تعین سے ارفع واعلیٰ ہے۔ ہم سورج کو آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری چشم تیرہ اور نگاہ خیرہ ہو جائے گی اگر اس کا عکس پانی میں دیکھیں تو ایک کیفیت ذہن میں اس کے متعلق پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح ہم اسمأ اور صفات میں اسے دیکھتے ہیں۔

"برہان" دو قسم کی ہیں ایک "تشبیہی" اور یہ استدلال عقلیہ ہے اور دوسری "تنزیہی" یہ وجدانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت پر استدلال قرآن میں انہی دو برہان سے کیا گیا ہے۔ ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ استدلال عقلیہ عصائے کور ہے جب تک چشم بینا رہبری نہ کرے خطرہ ہی خطرہ ہے اور یہ بصیرت اللہ ہی کی عطا کی ہوئی ہے۔ تنزیہی دلیل نور باطن ہے۔ آفتاب کو آفتاب کی روشنی میں دیکھنا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" "عرفت ربی بنور ربی" (حدیث) آفتاب کی ضیاء اور نور ہی آفتاب تک رہبری کرتا ہے "ہمیں نور است رہبر تا بخورشید" نور باطن فطرۃً مل چکا ہے مگر وہ محجوب ہے۔ اس کے لئے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی ضرورت ہے اس کے بعد کسی استدلال عقلیہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ تزکیہ وتصفیہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم دلیل کسی امر کو ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں، اور

شدہ حقیقت تسلیم نہیں کی جاتی جب تک دلیل کو تسلیم نہ کیا جائے۔ ثابت تو یہ کرنا ہے کہ اصل الاصول ایمان باللہ ہے۔ اس کے ثبوت میں چند براہان قرآن عظیم نے بتائے ہیں۔ جب تک انہیں تسلیم نہ کیا جائے اللہ پر ایمان بھی کوئی نہ لائے گا یعنی ان پر بھی ایمان لانا اصول میں داخل ہے۔ یہ یوم آخرت اور ملائکہ اور الکتاب اور نبیین ہیں جس کا مذکور آیات محولہ بالا میں کیا گیا ہے۔

یوم الآخر حق و باطل کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ باطل سے نہ کچھ پیدا ہوتا ہے اور نہ پیدائش کو باطل دہرا سکتا ہے اس کے خلاف حق پیدائش کو دہراتا ہے۔ باطل عبث اور بے نتیجہ بات ہے اور حق کے نتائج واضح ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ کائنات باطل ہوتی تو ایک صورت موہومہ ہوتی اور نہ اس کا ارتقائی نتیجہ مشاہدہ ہوتا۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ کائنات بالحق قائم ہے اور اس کی پیدائش بے نتیجہ نہیں۔ اس طرح اگر انسان اپنی انفرادی صورت میں ایک عبث اور بے نتیجہ ہستی نما عدم ہے اگر اسی طرح ارض وسموات کی پیدائش عبث ہے تو یہ باطل ہے۔ ارشاد قرآن ہے کہ

وما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلاً ذلك ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار کتب انزلنه الیك مبٰرك لیدبروا آیته و لیتذکر اولوا الالباب" (پ ۲۳)	ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ گمان ان لوگوں کا ہے۔ جو کافر ہیں۔ پس جو کافر ہوئے، وائے ہے ان پر آگ کی وجہ سے (جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ان کا گمان ہے کہ وہ جو کچھ فتنہ و شر اور فسق و فجور کے مرتکب ہوں کوئی پوچھنے والا نہیں وہ اسی فریب نفس میں الجھے ہوئے ہیں) کیا ہم ان لوگوں کو ایمان لائے (کہ ہمارے اعمال کی بازپرس ضرور ہوگی) اور نیک عمل کئے ان لوگوں کی

طرح کردیں گے جو زمین میں مفسدہ پرداز ہیں۔ کیا ہم متقی لوگوں کو بدکاروں کی مانند کر دیں گے (کافروں کا گمان ہے کہ خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے) ہم نے کتاب تیری طرف برکت والی نازل فرمائی ہے تاکہ اس کی آیتوں میں تدبر کریں اور صاحبان عقل و ہوش تذکر سے کام لیں۔

اگر یوم آخرت نہ ہو اور اس پر ایمان نہ ہو تو ضرور ہے کہ انسان اپنی دنیوی زندگی اور اس کے آرام و آسائش اور لہو و لعب غرض ہر ایک دنیوی فائدہ کو اپنی زندگی کی غرض و غایت سمجھے گا اور امر واقعہ یہ ہے کہ اکثریت یہی کچھ گمان کرتی ہے اگر یوم آخر پر پختہ ایمان ہو تو یہ شور و شر اور فتنہ فساد جو بحر و بر میں برپا ہے اور مانع ارتقاء انسانی ہے ختم ہو جائے۔ حقیقت یہی ہے کہ لوگوں کا ایمان اللہ پر نہیں اگر اللہ پر ایمان ہو تو یہ بھی یقین ہو کہ ہمارے اعمال کی باز پرس کرنے والا بھی ہے۔ اور ویسے باز پرس ہوتی بھی رہتی ہے۔ یہاں دنیوی زندگی میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ "کیف کان عاقبۃ المکذبین"۔ اگر انسان کا نگران حال کوئی اور نہ ہو تو جو چاہے کرے اور جو چاہتا ہے کرتا تو ہے مگر مواخذہ بھی ہو جاتا ہے، یہ مواخذہ کرنے والا کون ہے؟ اگر ذرا بے اعتدالی دانستہ یا نادانستہ کر بیٹھے تو اس کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

اگر یوم آخر ایک فطری امر واقعہ ہے (A FACT IN NATURE) تو کوئی مانے یا نہ مانے یہ اپنے وقت پر ہو کر ہی رہے گا۔ اسی طرح کوئی اللہ پر ایمان لائے یا نہ لائے اللہ کا کیا بگاڑ سکتا ہے اور اب جب کہ اکثریت عملاً ایمان سے خالی ہے تو کیا بگاڑ لیا۔ "لا اکراہ فی الدین"۔ انسان اگر کچھ بگاڑتا ہے تو اپنا آپ ہی۔ اور اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ یہ اسی بے یقینی کا نتیجہ ہے کہ عالم انسانی میں نار حرب مشتعل ہے اور یہی انسان ہی اس کا ایندھن بنے گا۔

ارشاد قرآن ہے کہ

ایحسب الانسان ان یترک سدًی
الم یک نطفۃ من منی یمنٰی، ثم
کان علقۃ فخلق فسوّٰی، فجعل
منہ الزوجین الذکر والانثٰی،
الیس ذٰلک بقٰدر علٰی ان یحیٔ
الموتٰی۔ (پ ۲۹)

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس کو یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ ایک بوند نطفہ کی نہ تھی جو شکم میں ڈالا جاتا ہے پھر اس سے علقہ بنا۔ پس اس کی پیدائش شروع ہوئی اور اس کے نفس کا تسویہ کیا۔ اور پھر اسی سے دو جوڑے ذکور و اناث بنائے (کیا یہ سب کچھ انسان اپنے اختیار و ارادہ و قدرت سے کرتا رہا ہے) کیا وہ (جس نے یہ سب کچھ بنایا عبث ہے اور) کیا وہ مردہ کو زندہ کرنے پر قادر نہیں۔

"یوم آخرت" پر ایمان ایک اصولی امر ہے۔ لیکن قرآن بطور عقیدہ کے یہ بات نہیں منواتا۔ وہ تذکر و تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور کتاب کائنات کی طرف مشاہدہ کی ہدایت فرماتا ہے

المّرٰ، تلک آیٰت الکتٰب، والذی
انزل الیک من ربک الحق ولکن اکثر
الناس لا یؤمنون، اللہ الذی رفع
السمٰوٰت بغیر عمد ترونہا ثم
استوٰی علی العرش وسخر الشمس
والقمر، کل یجری لاجل مسمًّی،
یدبر الامر یفصل الآیٰت لعلکم
بلقاء ربکم توقنون۔ وھو الذی
مد الارض وجعل فیہا رواسی و
انہٰرًا، ومن کل الثمرٰت جعل
فیہا زوجین اثنین یغشی الیل النہار

المرٰ، وہ آیات ہیں کتاب (کائنات) کی اور اس کی جو تیری طرف تیرے پروردگار سے الحق نازل کیا گیا۔ (یعنی قرآن) لیکن اکثر آدمی ان پر ایمان نہیں لاتے، اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا تو مشاہدہ کر رہا ہے۔ پھر عرش پر متمکن ہوا اور مسخر کیا سورج اور چاند، ہر ایک وعدہ مقرر کی طرف چل رہا ہے تدبیر کرتا ہے ہر ایک امر کی اور آیات کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ لوگوں کو اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین ہو۔ وہی ہے جس نے زمین کو کھینچا اور اس میں پہاڑ رکھے اور دریا، اور ہر ایک قسم کے پھل جو دو قسم کے جوڑے ہیں، ڈھانک دیتا ہے رات دن کو۔ اسمیں

ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون۔	اہل فکر کے لئے ہیں اور زمین میں قطعات مختلف
وفی الارض قطع متجورات وجنّٰت	ایک دوسرے کے نزدیک ہیں اور انگوروں کے
من اعناب وزرع ونخیل صنوان	باغ اور کھیتیاں اور کھجوریں کم وبیش شاخوں والی
وغیر صنوان یسقٰی بماء ونفضّل	ایک ہی پانی سے سیراب ہوتی ہیں اور ایک کو
بعضہا علٰی بعض فی الاکل، انّ فی	دوسرے پر میووں میں فضیلت دی ہے۔ اس میں
ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون، و	آیات ہیں اہل عقل کے لئے (ان آیات کے مشاہدہ
ان تعجب فعجب قولہم، اذا کنّا	کے بعد) اگر تو کسی بات پر تعجب کرے تو ان کے
ترابًا ءانا لفی خلق جدید، اولٰئک	قول پر تعجب کر جو کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی میں مٹی
الذین کفروا بربہم واولٰئک الاغلال	ہو گئے تو کیا پھر سے خلق جدید میں آئیں گے۔ یہ قول
فی اعناقہم، واولٰئک اصحٰب النار	ان لوگوں کا ہے جو اپنے پروردگار کے منکر ہیں۔ یہ
ہم فیہا خٰلدون"	وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہیں اور یہ
(۱۳)	ہم نشین ہیں آگ کے اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے

قرآن میں "برہان" اور بھی مذکور ہیں مگر یہ ایک مستقل موضوع ہے اس پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ انسان کو اتنا تو سوچنا چاہیئے کہ وہ ابتداء میں کچھ بھی نہ تھا۔ جمادات سے ترقی کرتا ہوا اب انسان بنا۔ اب تو کچھ ہے اس لئے "خلق جدید" کا انکار محض فریب نفس ہے لیکن عام عقیدہ کہ قیامت ایسا وقت ہے جبکہ کل کائنات فنا ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور صنعت کاملہ کے نامناسب ہے۔ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ انسان مسلسل ترقی کرتا ہوا آ رہا ہے، اور یہ کہ اس کا "آخر" اول سے بہتر ہے۔ "والاٰخرۃ خیر لک من الاولیٰ" "والاٰخرۃ خیر وابقٰی" مسئلہ ارتقاء یہ ہے کہ اوّل سے آخر بہتر اور باقی رہنے والی بہتر شے ہے والعاقبۃ للمتقین اور باقیات الصالحات

(SURVIVAL OF THE FITTEST) اس لئے یہ کائنات کچھ بچوں کا کھیل تو نہیں کہ کھلونا دل بہلانے کے لئے بنایا اور توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

"وما خلقنا السماء والارض وما بينهما لعبين، لو اردنا ان نتخذ لهوا لاتخذنه من لدنا ان كنا فعلين، بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق ولكم الويل مما تصفون" (پ۱۷)	اور ہم نے آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ایک کھیل نہیں بنایا اور اگر ہم ایسا ہی مشغولہ بنانا چاہتے تو کیا امر مانع تھا۔ بنا لیتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم حق کو باطل پر پھینکتے ہیں۔ سو باطل کا بھیجا نکل آتا ہے اور وہ فنا ہو جاتا ہے اور ویل ہے تم پر کیسی باتیں بناتے ہو۔

مسئلہ ارتقاء یہی ہے کہ ہر ایک ناکارہ شے فنا ہو جاتی ہے اور جو اس سے بہتر ہے وہ باقی رہتی ہے۔ قرآن عظیم کی کئی باتوں کی تصدیق اس وقت تک اہل علم و حکمت کر چکے ہیں لیکن ابھی بہت سی باتیں ہیں جن کی تصدیق ذہنی ارتقا کے ساتھ ہوتی جائے گی۔ مسئلہ حیات بعد ممات اہم بھی ہے اور تحقیق جاری ہے جو تحقیق ہو چکا ہے اس سے تصدیق ہی ہوتی ہے۔

ملائکہ

"جبریل" اور "روح" اور "ملائکہ" اصطلاحات اہل کتاب کی ہیں۔ اور آیات متشابہات سے موسوم ہیں اور تاویل کی محتاج ہیں۔ اور ان کی تاویل قرآن میں بذریعہ محکمات کی گئی ہے۔ ملائکہ کے بارے میں ارشاد قرآن ہے کہ یہ انسان کے خادم ہیں۔

"واذ قلنا للملئكة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابليس، ابى واستكبر وكان من الكفرين" (پ۱)	اور ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، انکار کیا اور اکڑ بیٹھا اور وہ کافروں میں سے ہے۔

ان آیات سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ ملائکہ انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کا ایک خادم ہو اور وہ پورا دیانت دار ہو بلکہ بددیانتی اس کی فطرت سے بعید تر ہو تو واجب ہے کہ آپ بھی اس پر کامل اعتماد کریں۔ اس طرح آپ کے تمام کام خوش اسلوبی سے سرانجام پائیں گے۔ اس کے خلاف اگر آپ کا نوکر بددیانت ہو اور فطرۃً بددیانت ہو تو آپ کے ہر ایک کام میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور اگر یہ بددیانت نوکر ایک دفعہ سمجھ لے کہ مجھے "بدھومیاں" ملے ہوئے ہیں اور آپ پر کسی نہ کسی طرح سے اپنا اعتبار جمالے تو اگر آپ ذرا عقل و فکر سے کام لیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیگا۔ اس خادم کو اصطلاح اہل کتاب میں شیطان یا ابلیس کہتے ہیں۔ آپ ضرور دل میں کہیں گے کہ میں ایسے بدذات نوکر کو رکھ کر اپنی عاقبت کیوں خراب کرنے لگا۔ بالکل بجا فرمایا آپ نے، لیکن آپ ذرا عالم انسانی پر نظر کریں بلکہ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر اپنی حالت کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ اکثریت کی خدمت یہی شیطان خاطر خواہ کر رہا ہے اور ہم کچھ ایسے مجبور اور بے بس اپنے آپ کو پاتے ہیں کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے اسی کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں۔ آپ لاکھ "لاحول" پڑھیں یہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کچھ ایسی ہی محبت اسے آپ سے اور آپ کو اس سے ہے کہ آپ خودبخود اسی کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ کسی صاحبدل نے خواب میں شیطان کو دیکھا، چہرہ آفتاب کی طرح روشن غرض حسن و جمال کا مجسمہ، حیران ہو کر پوچھا کہ میں تو یہی سنتا آیا کہ تو انتہائی بدصورت ہے۔ شیطان نے کہا کہ "قلم در کف دشمن است" جیسی چاہے میری تصویر بنادے۔ بات بھی یہی ہے کہ اگر ان اشیاء میں جن کو "منہیات" کہا جاتا ہے کشش نہ ہو تو کون ان کے نزدیک جائے گا۔ غرض "از ماست کہ بر ماست"

یہ دنیا کتنی خوب صورت ہے۔ اس کے لیل و نہار کتنے دلکش ہیں اور اس کے مناظر "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست" یہ سب کچھ یہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ نے ہماری خدمت کے لئے مسخر فرما دی ہے حالانکہ اس کا ایک ذرہ بھی ہمارا پیدا کردہ نہیں ہے۔

"وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعاً منہ ان فی ذالک لایت لقوم یتفکرون"	جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے ہم نے سب کچھ اپنے فضل وکرم سے تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ تحقیق ان میں آیات اہل فکر کے لئے ہے۔

ہوا کو کیا پڑی ہے کہ ہماری جان پروری کرے۔ پانی کو کس نے مجبور کیا ہے کہ ہماری پیاس بجھائے۔ یہ آسمان، کیسی خوبصورت مزین سقف ہے۔ یہ پہاڑ اور دریا اور ندی نالے، اور باغات اور میوے اور کھیتی غرض

"اتٰکم من کل ما سالتموہ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا ان الانسان لظلوم کفورا۔ (پ۱۳)"	تمہیں وہ کچھ دیا، ہر ایک وہ شے دی جس کی تمہیں ضرورت ہے اور اگر اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو گن نہ سکوگے بات یہ ہے کہ انسان ظالم اور کافر ہے۔

عالم شہادت یعنی محسوسات خارجی کی نعمتیں ہی شمار نہیں ہو سکتیں۔ جو مادی فوائد ہیں ان کے علاوہ جو اصل اور غیر محدود دیرپا نعمتیں ہیں ان کو قرآن میں "الغیب" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کا انکشاف اہل عقل وفکر پر ہی ہوتا ہے۔ یاد ہیگا۔

ان آیات بینات کا اثر جو کچھ میرے دل و دماغ پر ہوا۔ وہ ان الفاظ میں زبانِ قلم پر آیا۔ بغرض تفنن طبع ملاحظہ ہو۔

یہ زمیں میرے لئے وہ آسماں میرے لئے
اور ان دونوں کے سب کچھ درمیاں میرے لئے
نعمتیں ہر دو سرا کی آشکارا و نہاں

یہ جہاں میرے لئے اور وہ جہاں میرے لئے
ظاہر و باطن بلند و پست سب میرے لئے
بحر و بر اور خشک و تر، کون و مکاں میرے لئے
یہ نسیمِ روح پرور یہ بہارِ گل فروش
لا رہی ہے مژدۂ باغِ جناں میرے لئے
حسنِ صورت، حسنِ معنی دیدہ و دل کے لئے
ساز و سامانِ محبت بھر جہاں میرے لئے
تابِ مہرِ نیم روز و نورِ ماہِ نیم ماہ:
یہ ہجوم جلوۂ سیارگاں میرے لئے
گردشِ گردونِ گرداں انقلابِ روزگار
صورتِ عمرِ رواں آبِ رواں میرے لئے
راندۂ درگاہ اک ہستی میری خاطر ہوئی
اور مقرب بندگانِ سبحہ خواں میرے لئے
زندگی دنیا کی لطفِ زندگی میرے لئے
آخرت میں بھی حیاتِ جاوداں میرے لئے
یہ تو سب میرے لئے ہے میں ہوں کس کے واسطے؟
غیب سے آئی صدائے ناگہاں "میرے لئے"

غرض وہ تمام وسائل اور ذرائع جو ہماری مادی اور ذہنی زندگی کی ضروریات ہیں کائنات خارجی اور ہمارے نفوس میں موجود ہیں۔ اور ان کا فطری تقاضا ہے کہ اسی کام میں آئیں جس کے لئے خلق ہوئے ہیں۔ ان کا جائز یا ناجائز استعمال ہمارے اختیار میں ہے۔ جائز استعمال سے مراد اس غرض کی تکمیل ہے جس کے لئے اشیاء

دضع ہوئی ہیں۔ اگر ان کو غیر محل استعمال کیا جائے تو یہ ظلم وکفر ہے جو ناجائز ہے۔

قرآن میں مفصل مذکور ہے کہ ملائکہ کن کن خدمات پڑ مامور ہیں وہ اللہ والوں کو بشارت دیتے ہیں۔ مصائب میں ان کو ثابت قدم رکھتے ہیں اوران کی حفاظت میں وحی کا نزول ہوتا ہے، مزید بحث "الکتاب" اور "النبیین" کے تحت کی جاتی ہے۔

الکتاب

ایمان باللہ اور یوم آخر اور ملائکہ کے ساتھ الکتاب پر ایمان اصول اسلام میں داخل ہے۔ الکتاب کیا ہے؟ اس کی تعریف قرآن حکیم کی آیات میں مفصل کی گئی ہے۔

"ماکان ھذا القرآن ان یفتری من دون اللہ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتٰب لاریب فیہ من رب العٰلمین" (۱۰/۳۷)	یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اس کو (لفظاً و معناً) کوئی باندھ سکے اور (جیسا کہ لوگوں کو گمان ہے کہ یہ محمدؐ کے دل کی بنائی باتیں ہیں یہ تو نہیں) لیکن یہ تصدیق فرماتا ہے کتب سابقہ کی اور تفصیل ہے الکتاب کی (جس کی تعریف ہے) لاریب فیہ (اس میں کوئی الجھن نہیں ہے جو تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے)

لہ میں اپنا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ میں بصرہ سے چالیس میل کے قریب ایک سرکاری کام پر بحیثیت مہتمم بندوبست مامور تھا۔ ماتحت عملہ کا کام دیکھنے کیلئے نکلا تو بارش شروع ہو گئی میرے اوپر برساتی تھی میں ریل کی پٹڑی پر چڑھ گیا اور سلیپروں پر چلتا رہا معاً مجھے خیال آیا کہ اس وقت عملہ باہر کام نہیں کر سکتا۔ اس لئے الٹے پاؤں سلیپروں پر لوٹا۔ یک لخت میں سلیپروں سے اتر کر پٹڑی سے قریباً ایک گز کے فاصلہ پر اتر آیا۔ اور ساتھ ہی ریل گاڑی میرے قریب ہی گذر نے لگی۔ میں مبہوت کچھ دیر کھڑا رہا۔ حیران تھا کہ کس طاقت نے مجھے پٹڑی سے اتار دیا اور میں بچ رہا۔

"بین یدیہ" میں کل کتب مقدسہ سابقہ آجاتی ہیں۔ قرآن ان کی تصدیق فرماتا ہے اور بغرض تصدیق ان کی آیات کا حوالہ بھی دیتا ہے جو ہماری بحث کا موضوع متشابہات کے تحت رہا ہے۔ قرآن خود کتب سابقہ نہیں، اسی طرح "الکتاب" کی تفصیل ہے خود الکتاب نہیں۔ اس کی تائید اور قرآنی آیات سے بھی ہوتی ہے۔

"الٓمّٓ، ذٰلک الکتٰب لاریب فیہ" (پ ۱)	وہ الکتاب (جسکی تعریف ہے) لاریب فیہ۔

کفار اور اہل کتاب کو قرآن میں ریب ہے۔ "وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا" لوگ تو خدا کے بھی منکر ہیں، علاوہ ازیں قرآن میں اشارہ قریب "ھذا" قرآن کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اشارہ بعید "ھذاک" ہے جس کا مخفف "ذاک" ہے۔ بعید تر اشیاء کے لئے اشارہ "ذالک" ہے جس کا مونث "تلک" ہے "ذالک" عظمت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اور جو شے دسترس سے باہر ہو وہ باعظمت ہی ہوتی ہے۔

"الٓرٰ، تلک آیٰت الکتٰب والقرآن مبین" (پ ۱۴)	وہ آیات ہیں الکتاب اور قرآن مبین کی
"طٰس، تلک آیٰت القرآن وکتاب مبین" (پ ۱۹)	وہ آیات ہیں قرآن اور کتاب مبین کی۔
"الٓمّٓرٰ، تلک آیٰت الکتٰب والذی انزل الیک من ربک الحق، ولکن اکثر الناس لایؤمنون" (پ ۱۳)	وہ آیات ہیں الکتاب کی اور اس کی جو تیری طرف (قرآن) تیرے رب کی طرف سے الحق نازل کیا گیا ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اسی الکتاب کو "کتاب مکنون" (پ ۲۷) اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کے اسرار پوشیدہ ہیں "لایمسہ الا المطہرون" اور اس تک رسائی نفوس قدسیہ ہی کی ہوتی ہے۔ اسی کو "لوح محفوظ" اس لئے کہا گیا ہے کہ کسی شیطان کی اتنی جرأت نہیں کہ اس میں دخل دے۔ اسی کو "ام الکتٰب" اس لئے کہا گیا ہے کہ تمام

کتب مقدسہ اور دیگر علوم کی کتابیں اسی سے ماخوذ ہیں۔

"لکل اجل کتاب، یمحوا اللہ ما یشآء ویثبت وعندہٗ ام الکتب" (پ ۱۳)	اور ہر ایک شے کی اجل لکھی ہوئی ہے۔ اللہ جو چاہے محو کر دیتا ہے اور جو چاہے ثابت رکھتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب ہے۔

اس کے اور بھی نام قرآن میں مذکور ہیں مگر فہم و تفہیم کے لئے یہی کافی ہیں الکتاب کتاب کائنات یا صحیفہ فطرت ہے۔ یہی سرچشمہ "وحی" بھی ہے۔

"اتل ما اوحی الیک من الکتب (پ ۲۱)	جو کچھ تجھے الکتاب سے وحی ہوتا ہے۔ تلاوت کر۔

"قرآن" کے معنی ہیں "پڑھنا" اور پڑھنا کسی کتاب ہی کا ہوتا ہے۔

"ہر آن کو را کہ جانش در تجلی است　　همه عالم کتاب حق تعالیٰ ست" (گلشن راز)

خالق السموات والارض وما بینہما اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ سے بعید تر ہے کہ وہ کوئی باطل شے پیدا کرے۔ اہل ذکر و فکر جب کائنات کی تخلیق میں نظر کرتے ہیں تو اسی صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کائنات بالحق قائم ہے اور تمام حکماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "ربنا ما خلقت ھذا باطلا"

ارشاد قرآن ہے کہ

"وما خلقنا السماء والارض وما بینہما باطلا ذالک ظن الذین کفروا" (پ ۲۳)	اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، باطل پیدا نہیں کیا ایسا گمان وہ لوگ کرتے ہیں جو اس کے حقائق کے، منکر ہیں۔

اگر اسے باطل قرار دیا جائے تو تمام علوم و فنون جو اسی سے ماخوذ ہیں باطل ٹھہریں گے اور ذہنی اور مادی ارتقا جو اسی کے مشاہدہ پر موقوف ہے بے معنی ٹھہرے گا۔ جب نص قرآنی کی رو سے اس کا انکار کفر ہے تو اس پہ ایمان کامل ہونا چاہیئے

اسی ایمان کے ساتھ اہل ذکر وفکر اس کی گہرائیوں میں غوطے لگاتے ہیں اور دُرِّ مقصود نکال لاتے ہیں۔ اس کتاب مکنون کے امکانات لامحدود ہیں۔ ذرہ ذرہ میں وہ امکانات ہیں جو ہمارے ذہنی ارتقاء کے ساتھ منکشف ہو رہے ہیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کسی ایک شے کے حقایق پر کامل احاطہ پالیا ہے۔

قرآن حکیم الکتاب کی کلید ہے۔ اور یہی کلید سلف صالحین کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ دنیا پر چھا گئے۔ جب مسلمانوں پر ذہنی جمود چھا گیا تو اس طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی اور تنزل میں آ رہے ہے۔ آج جو قومیں "الکتاب" کے مطالعہ میں منہمک ہیں وہی اہل فکر کائنات کو مسخر کر رہے ہیں اور اسی کے بل بوتے پر کرۂ ارض پر مسلط ہیں۔ یہود و نصاریٰ اس لئے کہ نام کے یہود و نصاریٰ ہیں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہم خدا کے بیٹے اور پیارے ہیں اور جنت کے واحد اجارہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ غلط فہمی دور کر دی کہ تم بھی ایسی ہی مخلوق ہو جیسے اور بشر ہیں۔ جو بھی نیک کام کرے گا اسے اجر ملے گا اور جو بُرا فعل کرے گا سزا پائے گا۔ نادان مسلمان بھی یہود و نصاریٰ کی سی باتیں بناتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ دوزخ کی آگ ہمیں چھو نہیں سکتی اور اگر چار و ناچار بداعمالیوں کی سزا بھگتنی ہی پڑ گئی تو "ایاماً معدودات" "یہی چند روز" دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست" اگر اب بھی مسلمانوں میں اپنی نکبت اور ادبار کا احساس نہ ہو تو سنت اللہ کبھی تبدیل و تحویل نہیں ہوئی، ارشاد قرآن ہے کہ

"ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم واذا اراد اللہ بقوم سوءً فلا مرد لہ وما لھم من وال" (۱۳/۱۱)	اللہ تعالیٰ کسی قوم کے معاملات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت کو خارجی حالات کے مناسب نہ بدلے اور (جب اس پر ذہنی جمود چھا جاتا ہے اور نہیں بدلتی) اللہ کا ارادہ اس کی خرابی کا ہو جاتا ہے اور (اس کے

برے دن آجاتے ہیں، ٹالے سے نہیں ٹلتے۔ البتہ اگر عذاب ذلت و مسکنت سے متنبہ ہوکر رجوع کرے تو اللہ کے سوا اور کوئی کارساز بھی نہیں۔

ہمارا موضوع اجازت نہیں دیتا کہ اس اہم مستقل موضوع پر تفصیلی بحث کریں یہی اشارات کافی ہیں، مزید بحث "نبیین" کے تحت کی جاتی ہے۔

"النبیین"

یہ اہم مستقل موضوع ہے۔ اس پر ہم کسی قدر تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں۔

"نبی" مشتق ہے "نبا" سے۔ اس کے معنی ہیں "خبر"۔ حکماء کے نزدیک حصول علم کے تین ذرائع ہیں۔ ایک مشاہدہ اور تجربہ، دوسرے استدلال عقلیہ اور تیسرے "خبر صحیح"۔ خبر سچی اور جھوٹی ہر ایک قسم کی ہوتی ہے۔ اور تینوں زمانوں ماضی و حال اور مستقبل کے متعلق بھی ہوتی ہے۔ خبر دینے والا ثقہ بھی ہوتا ہے اور فاسق و فاجر بھی "نبا" کا اطلاق ہر ایک قسم کی خبر پر ہوتا ہے۔ ایسی خبریں جو زمانہ ماضی و حال کے متعلق ہوں ان کی صداقت پرکھی جاسکتی ہے لیکن جو آیندہ زمانہ کے متعلق پیش گوئی ہو اس کی صداقت اسی وقت معلوم ہوگی۔ جب وہ واقع ہو یا خبر دینے والا بتائے کہ اس کا علم اسے کیسا ہُوا اور یہ علمی خبر ہو۔ ایک نبی خبر دیتا ہے کہ لوگوں کی بداعمالی کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہوگا۔ یہ ایسی خبر ہے جس کی تصدیق ماضی کے حالات و واقعات سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور قانون فطرت کے تحت بالکل صحیح خبر ہے اور تاریخ ایسے واقعات کا اعادہ کرتی رہتی ہے۔

امم سامیہ میں یہ اصطلاح بہت پرانی ہے۔ بابل اور نینوا سے جو "کتابے" برآمد ہوئے ہیں ان میں "حمورابی" کا ضابطہ آئین و قوانین بھی ہے۔ شریعت موسوی اور ان میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ معبد کا خاص احترام تھا اور ان کے پجاری یا متولی "نبی" کہلاتے۔ لوگ خوابوں کی تعبیر انہی سے دریافت کرتے اور شُبھ گھڑی

شبھ لگن مہورت بھی یہی بتاتے، عوام یہ یقین کرتے کہ ان کا تعلق براہ راست دیوتاؤں سے ہے اور وہی انہیں غیب کی خبریں دیتے ہیں۔ یونان میں بھی ایسے معبد بہت تھے۔ "ڈلفی" کے نبی اور ہیکل کے اقوال مشہور ہیں۔ یونان میں لفظ "پروفٹ" مرکب ہے "پری" بہ معنی "پیش" اور "فی" بہ معنی "نطق" یعنی پیش گوئی کرنے والا۔ ایران اور ہندوستان میں بھی امم سامیہ کی طرح اوتار اور رشی اور منی گذرے ہیں۔

تمام انبیاء و رسل "ازمنۂ تاریک" (DARK AGES) یا ایام جاہلیت میں گذرے ہیں۔ ان ایام کی ایک خصوصیت ہے کہ عام فہم انسانی بالغ نہ تھا۔ مظاہر قدرت ارضی و سماوی کو دیوتا اور دیویاں تصور کرتے۔ اور ان کی پوجا کرتے آج ذہنی ارتقا اتنا بلند ہے کہ یہ دیوتا اور دیویاں ملائکہ کی طرح آدم کو سجدہ کرتی ہیں اور ہماری پوجاری ہیں۔ ان ایام میں چند گنتی کے اشخاص جن کا فہم ارفع و اعلیٰ تھا۔ امم سامیہ میں انبیاء و رسل اور ملوک اور امم آریہ میں اوتار اور رشی اور منی اور راجوں سے موسوم تھے۔ یہ دو حکومتیں دینی اور دنیوی تھیں اور دونوں شخصی تھیں۔ باپ کے بعد بیٹا جانشین ہوتا۔ یہ قانون (LAW OF — PRIMOGENITURE) آج بھی کہیں کہیں رائج ہے۔ احکام شریعت کا وضع کرنا انبیاء و رسل کا کام تھا اور اس کا نفاذ ملوک کے ذریعہ ہوتا۔ لیکن انبیاء کی حکومت لوگوں کے دلوں پر تھی۔ اور دنیوی حکومت بھی ان سے دبتی تھی۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ انبیاء بادشاہ گر تھے۔ بہرحال ان ایام میں یہی کچھ ممکن تھا اور ان ایام کی تاریخ میں انبیاء اور ملوک ہی کا تذکرہ ملتا ہے۔ جمہور بمنزلہ صفر ہیں۔ بنی اسرائیل کے تاریخی حالات میں جو توراۃ و صحف انبیاء اور انجیل میں مذکور ہیں انہی انبیاء اور ملوک ہی کا ذکر ہے۔ ان کے انحطاط کے زمانہ میں انبیاء اور انبیاء زادوں کی تعداد ایک ہی وقت

میں سینکڑوں تک تھی اور ان کی حالت ایسی ہی تھی جیسے ہمارے زمانہ میں خانقاہوں کے پیروں کی ہے۔ اور یہی حلقۂ ارادت اور یہی وجد و حالت کی کیفیت ان پر بھی طاری رہتی۔ اور لوگ خیال کرتے کہ ان پر روح القدس کا نزول ہو رہا ہے۔ حالت وجد میں اگر ان کے منہ سے کچھ کلمات نکلتے تو لوگ غیب کی خبر سمجھتے اور اپنے اپنے فہم کے مطابق مفہوم پیدا کرتے اور یقین کرتے کہ "یہ خدا کی بڑی بڑی باتیں امور غیب ہیں، بعض مسخرے پھبتی بھی جما دیتے کہ یہ نئی مے کے نشہ میں ہیں"۔

یہ امر کہ نبی، صاحب اختیار و حکومت ہوتا ہے قرآن کی متعدد آیات سے ثابت شدہ ہے۔

کان الناس اُمّۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتٰب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ۔ (پ۲)	ابتدا میں لوگ امت واحدہ ہی تھے (اور ان میں کوئی اختلاف نہ تھا جب اختلاف پیدا ہوا) تو اللہ نے نبیوں کو مبعوث کیا کہ نیکو کاروں کو بشارت اور بدکاروں کو عذاب سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ الکتاب

(کی آیات) نازل کیں بالحق تاکہ ان امور میں حکم کریں جن میں لوگوں کا اختلاف تھا۔

وما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ۔ (پ۳)	اور یہ کسی بشر کو حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اس کو کتاب اور حکومت اور نبوت عطا کرے اور (وہ ناجائز ذاتی فائدہ کے لئے) لوگوں سے کہے کہ میرے بندے ہو جاؤ اللہ کو چھوڑ کر۔

رسول کا کام صرف "بلاغ" ہوتا ہے۔ لیکن نبیوں کا کام بذریعہ حکومت منوانا بھی ہوتا ہے۔ انبیاء پر ایمان لانے کی ہدایت اس لئے دی گئی کہ ان کو "الکتاب" کا علم ہوتا ہے جس کی تشریح ہم کر چکے ہیں۔ اس لئے جیسے الکتاب پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح نبیوں پر بھی ضروری ہے۔ یہ حقیقت اب واضح ہو گئی ہو گی

ایمان باللہ کے تحت یوم آخر اور ملائکہ اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اس لئے ان کا تعلق ایک دوسرے سے ناقابل انفساخ ہے، کتاب کائنات کا علم ہمیں نبیوں کے ذریعہ ہی ملتا رہا۔ جب ان پر ایمان نہ ہوگا تو کتاب پر کب ہوگا اور کتاب کی وحی کے حامل ملائکہ ہیں جس کا مفہوم ہم واضح کر چکے ہیں، ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ شروع قرآن میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ ما انزل اللہ پر جو پہلے نازل ہو چکا ہے اور جو آنحضرتؐ پر نازل ہوا (قرآن)، ایمان لاؤ (۲/۱) اور قرآن اسی ما انزل اللہ کی جو کتب سابقہ ہیں ہے تصدیق فرماتا ہے۔ جسے ہم متشابہات کے تحت مثالاً بیان کر چکے ہیں۔

یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ نبیوں کو "الکتاب اور اس کی حکمت" ہی وحی ہوتی رہی ارشاد قرآن ہے

"ویعلمہ الکتب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل" (۳/۴۸)	اور اللہ اس (عیسےٰ ابن مریم) کو کتاب اور اس کی حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھائے گا۔

لیکن یہ تقاضا۔ ایام جاہلیت عوام پست ذہنیت کی وجہ سے صحیفہ فطرت اور اس کی حکمت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے انبیاء ان کو احکام کے تحت رکھتے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی تک ہدایت کافی سمجھی گئی تھی۔ ان احکام میں دس موسوی احکام تو بنی اسرائیل کے لئے اصولی احکام تھے۔ مسیحؑ نے ان میں سے "سبت" کا احترام اٹھا دیا اور امر توحید و نہی شرک کو ایک ہی حکم رکھا اس طرح یہ سات اصولی احکام انجیل (مقدس متی ۱۹/۱۸) میں مذکور ہیں اور یہی سات "سبعاً من المثانی" قرآن میں بھی ہیں۔ "المثانی" اسفار موسیٰ کی پانچویں کتاب کا نام ہے، جس کو یونانی ترجمہ میں "ڈیوٹرونومی" سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ سات احکام ہر ایک قوم کی شریعت اور دھرم شاستر اور "لاء" کے بنیادی احکام ہیں۔ ان احکام کے علاوہ توراۃ اور صحف

انبیاء میں وقتی احکام بھی ہیں۔ جن کو انبیاء ترمیم کرتے یا منسوخ قرار دیتے رہے۔ ایسے احکام کے متعلق چند اصولی ہدایات قرآن میں ہیں لیکن کوئی وقتی حکم نہیں۔ وقتی احکام غیر محدود اور ہمیشہ بدلنے والے حالات کے مناسب ہوتے ہیں۔ اور ان کا وضع کرنا قرآن نے "شوریٰ" پر چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے یہ منصب حکومت جو انبیاء کو حاصل تھا اب جمہور میں منتقل ہو گیا۔ لیکن قرآن نے حکومت کا تصور جیسا کہ جاہل ذہن میں تھا بدل دیا۔ سردست یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ صرف اتنا واضح کرنا مقصود ہے کہ ایام جاہلیت میں انبیاء صاحب حکومت تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا آں حضرت ؐ کے بعد بھی نبیوں کی ضرورت ہے؟ جو صاحب حکومت نہ سہی کتاب کائنات اور اس کی حکمت ہی سکھائے۔ یہ سوال ختم نبوت کے متعلق ہے۔ مسلمانوں کا پختہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت خاتم النبیین ہیں اور صحیح حدیث بھی ہے کہ "لا نبی بعدی" میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

ارشادِ قرآن ہے کہ

ما کان محمدٌ ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین (پ)	محمدؐ تم میں سے کسی کا باپ نہیں ہے لیکن وہ اللہ کا رسول اور نہ تمام نبیوں کی مہر ہے (ختم کرنے والا ہے)

تمام دنیاء اسلام کا یہ پختہ عقیدہ رہا ہے کہ آنحضرت آخری نبی ہیں اور اب نبوت ختم ہو چکی ہے۔ لفظ "ختم"[ف] کے معنی "مہر" ہیں اور جس پر مہر لگ جائے وہ بند ہو جاتی ہے۔ حسب ذیل آیات میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ (پ)	(کافروں کے) دلوں پہ اللہ نے مہر لگا دی اور ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

ف "ختم" اس لئے بھی صحیح ہے کہ قرآن کتب سابقہ کا مصدق ہے اس لئے ما انزل اللہ کا ذکر فرماتا ہے ان پہ مہر تصدیق بھی ثبت کرتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر اور آیات میں بھی کی گئی ہے۔

"انا جعلنا علی قلوبہم اکنۃ ان یفقہوہ و فی آذانہم وقرا" (پ۱۵)

ہم نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور کانوں میں گرانی ہے۔

"وجعلنا علی قلوبہم اکنۃ ان یفقہوہ و فی آذانہم وقرا و ان یروا کل آیۃ لا یؤمنون بہا" (پ۷)

اور ہم نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے کہ سمجھ بوجھ سے کام نہ لیں اور ان کے کانوں میں گرانی ہے اور اگر سب آیات کا ہی مشاہدہ کریں تو بھی وہ اس کے ساتھ ایمان لانے والے نہیں۔

"لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یبصرون بہا ولہم آذان لا یسمعون بہا اولئک کالانعام بل ہم اضل اولئک ہم الغافلون" (پ۹)

دل رکھتے ہوئے سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہوئے نہیں دیکھتے کان رکھتے ہوئے حق کی آواز پر کان نہیں دھرتے، ایسے لوگ تو چوپایوں سے بھی گئے گذرے ہوئے، یہی لوگ غافل ہیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جن کے دل پر مہر لگ جائے وہ قوت فکریہ سے کام نہیں لیتے اور حواس کے ہوتے محسوسات خارجی کا مشاہدہ عقل و فکر سے نہیں کرتے یہ چوپایوں سے بھی بدتر لوگ ہیں۔ اس لئے دلوں پر مہر لگنے سے دل کا فطری عمل فکر بند ہوگیا، مراد ہے۔ اسی کے ہم معنی حسب ذیل آیات ہیں۔

(۲) "قل ارءیتم ان اخذ اللہ سمعکم وابصارکم وختم علی قلوبکم" (پ۷)

کہو کہ دیکھو تو اگر اللہ تمہاری شنوائی اور بینائی لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے (تو کیا حالت ہو)

(۳) "وختم علی سمعہ وقلبہ وجعل علی بصرہ غشاوۃ فمن یہدیہ من بعد اللہ"

اور جس نے ہوا و ہوس کو اپنا معبود بنایا اللہ نے، اس کی شنوائی اور دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو اس کے بعد اللہ کے سوا کون ہدایت دے سکتا ہے

(۴) "یسقون من رحیق

(جو لوگ پسندیدہ زندگی میں ہوں گے) ان کو خالص رحیق

مختوم، ختمہ مسک" | مہر بند، جس پر مسک کی مہر لگی ہوگی پلائی جائے گی (نہ باہر سے کوئی شے اندر اور نہ اندر کی شے باہر جا سکتی ہے)

(۵) ام یقولون علی اللہ کذبا، فان یشاء اللہ یختم علیٰ قلبک" (پ۲۵)	کیا یہ کہتے ہیں کہ تو نے یہ قرآن اللہ پر بہتان باندھ لیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تیرے دل پر مہر لگا دیتا (کہ وحی ہی نہ ہوتی)

ختم کے ہم معنی لفظ "طبع" (مہر ثبت کرنا) بھی متعدد آیات میں استعمال ہوا ہے۔ "طبع اللہ علیٰ قلوبھم" (پ۱۰) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر ثبت کر دی"۔ نطبع علیٰ قلوبھم فھم لا یسمعون" (پ۹) ہم ان کے دلوں پر مہر ثبت کرتے ہیں تو وہ سن نہیں سکتے، ان آیات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مہر کے ثبت ہونے پر حواس اور قلب کا فطری کام بند ہو گیا۔ جس شے پر مہر لگا دی جائے تو وہ خارجی اثر قبول نہیں کرتی اور جو کچھ اس کے اندر فطری قوت خارجی اثر قبول کرنے کی ہے وہ بھی کام نہیں کرتی اس لئے "خاتم النبیین" کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انبیاء کی بعثت آیندہ کے لئے بند ہو گئی"۔ خاتم" کے لفظ میں بہ نسبت ایسے لفظ کے جس کا مفہوم بند کرنا ہو زیادہ زور ہے۔ صحف انبیاء میں بھی اور توریت و انجیل میں بھی آنحضرتؐ کی بعثت کی پیشگوئی واضح الفاظ میں ہے کہ وہ نبیوں کی مہر (خاتم النبیین) ہوگا۔ اور حضرت مسیحؑ حواریوں سے رفع سے پیشتر کہتے ہیں کہ "میں خدا سے دعا کروں گا کہ تمہیں ایک اور تسلی دہندہ دے جو تم میں ابد تک رہے گا" (انجیل، حسب روایت مقدس یوحنا ۱۴:۱۶)

ایک مشہور حدیث ہے کہ آنحضرتؐ کا سایہ نہ تھا۔ اہل حدیث باوجود اوعاء حدیث دانی اسے موضوع قرار دیتے ہیں۔ اسکی حقیقت وہ سمجھ نہ سکے

علامہ محمود شبستری نے "گلشن راز" میں اس پر لطیف بحث کرتے ہوئے داد تحقیق دی ہے کہ اس سے مراد "ظلّ نبوّت" ہے، جب افق آفرینش سے آفتاب ہدایت نبوت کی ضیا کے ساتھ طلوع ہوا اس وقت سماء دنیا ظلمت اور ارض ظلمت کدہ تھی چنانچہ آدمؑ سے عیسےؑ تک آفتاب نبوت آہستہ آہستہ نصف النہار کی طرف اونچا ہو رہا تھا اور سایہ اور سایہ کا تصور بھی صحیح تھا۔ جب آفتاب عین نصف النہار پر آگیا تو سایہ بھی محو ہو گیا۔

زمان خواجہ ما استوا بود | کہ از ہر ظل و ظلمت اصطفا بود

محمد مصطفےٰ کا عہد مبارک "استویٰ" ہے کہ ہر ظل اور بروز سے پاک اور مصفا ہے۔ آنحضرت صلعم پر آفتاب نبوت اپنی پوری شان سے جلوہ افروز ہوا اور دین الحق کلہ آپؐ پر ظاہر ہوا۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وکفی باللہ شھیدا (۲۸/۴۸)	وہی اللہ ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس پر اس دین کی حقیقت کلہ واضح ہو جائے، اور اس پر اللہ کی شہادت کافی ہے۔

یہ آفتاب نبوت خط استوا پر تا قیامت رہے گا۔ اس لئے امت مسلمہ کو "امۃ وسطی" کہا گیا ہے کہ خط استوا بھی نصف کرہ ارض پر واقع ہے۔ ایام جاہلیت کی ظلمت کافور ہو گئی اور لوگوں کو ظلمات سے نکل کر نور میں لایا گیا جہاں نور جلوہ افروز ہو وہاں ظل اور ظلمت کا کیا کام ہے۔

افحکم الجاھلیۃ یبغون، ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون، یاایھا الذین امنوا لا تتخذوا الیھود و	تو کیا اب ایام جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں (جن کا خاتمہ ہو گیا) اور اللہ سے بڑھ کر حکم میں اور کون ہو سکتا ہے۔ اے اہل ایمان یہود و نصاریٰ

النصاریٰ اولیاء" (مائدہ) | کو اپنا دوست نہ بناؤ (جو جاہلیت کی طرف دعوت دیتے ہیں)

یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ اگر کسی کا دعویٰ ہو کہ اسے وحی یا الہام ہوتا ہے یا خدا اس سے ہم کلام ہوتا ہے تو خواہ وہ سچا ہی ہو اس کی نبوت پر کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی کو بھی وحی ہوتی ہے۔ فرشتوں کو بھی وحی ہوتی ہے۔ فجور اور تقویٰ کا الہام بھی ہر ایک شخص کو ہوتا ہے۔ زمین اور آسمان کو بھی وحی ہوتی ہے۔ اور خدا کائنات کی ہر ایک شے سے ہمکلام ہوتا ہے حضرت موسیٰ کی والدہ کو بھی وحی ہوئی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی نبی اور نبیہ نہیں۔ نبوت اور نبی اصطلاح اہل کتاب کی ہے اور ہم نے اس کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے واضح کر دیا ہے کہ یہ ایام جاہلیت کے ہی مناسب تھی۔ البتہ اس کو ختم کرنے والا ایک نبی ہونا چاہیئے تھا۔ ایک حدیث جس کو اہل حدیث بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے نبوت کو ایک عمارت سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ اس میں ایک "کونے کے پتھر" کی کمی تھی۔ دیکھنے والے کہتے کہ معمار نے یہ کمی کیوں رکھی ہے۔ وہ پتھر میں ہوں۔ نبوت ایک منصب تھا۔ دینی حکومت تھی۔ اس کا خاتمہ آنحضرتؐ نے کر دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ "ملوکیت" کا خاتمہ ہو گیا۔ قرآن کے الفاظ میں جب آں حضرتؐ یہ اعلان کرتے ہیں کہ "لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" اور یہ کہ میں تم پر "حفیظ" اور "وکیل" اور "جبار" اور "مصیطر" نہیں ہوں تو ملوکیت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور آج تو بادشاہ اور راجہ اور نواب صرف نام ہی نام ہے جو دیر سویر مٹ جائے گا۔ اب علم و حکمت کی اشاعت عام ہے اور ہر ایک اہل نظر کتاب کائنات کے مطالعہ میں مصروف ہے اور وہ علمی اکتشافات اور فنی ایجادات ہو رہی ہیں کہ جس سے قرآن عظیم کی بیّنات کی تصدیق ہو رہی ہے

"سنریھم ایتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق
(ﷺ) اور جلد ہی ہم آفاق اور ان کے نفوس میں اپنی آیات کا مشاہدہ کرائیں
گے۔ یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

اس لئے یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ آنحضرتؐ
کے بعد اہل علم و حکمت ہی ہوں گے جو آیات قرآن کی تصدیق اسی طرح کریں
گے۔ جس طرح قرآن کتب سابقہ کی آیات کی محکمات سے فرماتا ہے۔ اس
لئے ان پر ایام جاہلیت کا نام "نبی" تو اطلاق نہیں کرے گا۔ لیکن جو کچھ اللہ تعالٰی
نے انہیں القا یا الہام یا وحی کی ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے اور جو نہیں
لائے گا وہ یقیناً خسارہ میں رہے گا۔ اور یہ مشاہدہ ہو رہا ہے کہ اہل علم پر جو کچھ
علمی اکتشافات ہو رہے ہیں جو قوم اسس کو اپناتی ہے۔ فائدہ میں رہتی ہے
اور جو اسے بدعت اور ضلالت کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ وہ محکوم و مغلوب و مقہور
ہیں۔ قرآن میں بار بار مذکور کتاب فطرت اور اس کی حکمت کا ہی ہے اور
یہ بھی ارشاد ہے کہ "جس کو حکمت عطا کرتے ہیں تو اس کو خیر کثیر دیتے ہیں۔" آنحضرتؐ
نے حصول علم و حکمت پر بہت زور دیا ہے۔ اور بہت احادیث صحیحہ اسی کے
بارہ میں ہیں کہ علم خواہ چین میں ہو وہاں سے لے لو (شاید قریب تر زمانہ میں یہ ایک
پیشگوئی ثابت ہو۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر تمہیں مغرب کے ایک سرے سے دوسرے
مشرق تک علم کی تلاش میں سفر کرنا پڑے تو یہ زحمت گوارا کر لو۔ آنحضرتؐ کو ارشاد
الٰہی یہ تھا کہ "قل رب زدنی علما" تو دعا مانگ کہ اے میرے پروردگار میرا علم زیادہ کر۔

پیغام خدا نخست آدم آورد	انجام بشارت ابن مریم آورد
باجملہ رسل نامہ بے خاتم بود	احمدؐ بر نامۂ خاتم آورد

لہ قرآن کی نسبت ارشاد کہ:- (باقی صفحہ ۱۷۰ پر)

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۶۹)

انا انزلنٰه فی لیلة القدر، وما ادراك ما لیلة القدر، لیلة القدر خیر من الف شهر، تنزل الملئكة و الروح فیها باذن ربهم، من كل امر، سلام هی حتی مطلع الفجر (پ ۳۰/۲۲)

ہم نے اس (قرآن) کو نازل فرمایا ہے، قدر والی رات میں، تجھے کیا معلوم قدر والی رات کیا ہے۔ قدر والی رات ایک ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ اس میں تیرے پروردگار کے اذن سے ملائکہ اور روح ہر ایک امر کی بابت نازل ہوتے ہیں۔ سلامتی ہے صبح کے طلوع ہونے تک۔

حٰمٓ، والكتاب المبین، انا انزلنٰه فی لیلة مبٰركة انا كنا منذرین، فیها یفرق كل امر حكیم، امرا من عندنا، انا كنا مرسلین، رحمة من ربك، انه هو السمیع العلیم۔ (پ ۲۵/۱۳)

قسم ہے کتاب بیان کرنے والی کی۔ تحقیق ہم نے اسے برکت والی رات میں نازل فرمایا ہے تحقیق ہم ہیں ڈرانے والے۔ اس میں ہر ایک امر محکم فیصلہ کیا گیا ہے۔ امر ہماری طرف سے۔ تحقیق ہم ہیں بھیجنے والے، رحمت تیرے پروردگار کی طرف سے، تحقیق وہی ہے سمیع اور علیم ہے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں "کل امر" دین کے متعلق آچکا ہے۔ اور ہر ایک امر فرداً فرداً ایک ہزار سال میں تکمیل پاتا ہے۔

یدبر الامر فی السماء الی الارض ثم یعرج فی یوم مقداره الف سنة مما تعدون۔ (پ ۲۱/۱۴)

آسمان سے زمین کی طرف امر کی تدبیر فرماتا ہے پھر اس کا کامل ارتقا ایک دن (یوم) میں ہوتا ہے۔ جو تمہاری گنتی کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔

قرآن میں "کل امر" کی تکمیل پچاس ہزار سال کے عرصہ میں ہوگی۔

"من الله ذی المعارج، تعرج الملئكة والروح فی یوم كان مقداره خمسین الف سنة" (پ ۲۹)

(کافروں کو عذاب جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا) اللہ کی طرف سے جو ذی المعارج ہے۔ ملائکہ اور الروح (جو لیلة القدر میں نازل ہوئے) اس کی طرف عروج کرتے

یعنی ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

چونکہ دین کا اظہار کلیۃً قرآن میں ہو چکا ہے اس لئے کہ قرآن کتب سابقہ کا مصدق ہے اور وہ امور جو قرآن میں مذکور ہیں۔ ان کی تصدیق عقلاً ہر ایک زمانہ میں ہوتی رہے گی۔ جیسے کہ ہو رہی ہے۔ اس لئے بھی کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

کتاب فطرت کا علم انبیاء کو جو ایام جاہلیت میں گزرے جزءاً اتنا ہی دیا گیا۔ جو ان ایام کی قومی ضروریات اور عام فہم کے مناسب تھا، یہ ایک "امر" تھا جس کی تکمیل ایک ہزار سال میں ہوئی چنانچہ زبور میں بھی مذکور ہے کہ ایک ہزار سال تیرے نزدیک ایک دن ہے جو کل گزر گیا اور ایک پہر رات کا" (زبور ۹۰) حضرت داؤد ؑ سے حضرت مسیح تک ایک ہزار سال کا عرصہ ہے اور ایک پہر رات وہ وقفہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے بحوالہ آیات قرآن واضح کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر "دین کلہ" کا اظہار ہوا اور یہ کہ قرآن میں "کل امر" کا مذکور ہے۔ ان کا عروج یا تکمیل جیسا کہ سورہ "ذی المعارج" کے شروع میں مذکور ہے پچاس ہزار سال میں ہوگا۔ اس لئے حسب پیشگوئی صحف انبیاء آنحضرت ؐ کی بادشاہت آخر نہ ہوگی اور اس کی شریعت دائمی ہے، جب "کل امر" کی تکمیل ہو جائے گی تو وہ دن قیامت کا ہوگا

قرآن میں "انسان" ہی کا بیان ہے کہ اس کی ابتدا کیا تھی۔ کتنے طبقات ہستی سے گزرتا ہوا وہ انسان بنا،

"ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی"

اور کیا کیا مرحلے طے کرتا ہوا آ رہا ہے اور کیا کیا ابھی اس نے طے کرنے ہیں اور کس مقام پر اس نے پہنچنا ہے۔ ان تمام امور کی خبر قرآن میں دی گئی ہے چونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے اس پر بحث ہم نے علیحدہ بھی کی ہے اور مفصل بحث

"علم الانسان" کے تحت کی جائے گی۔

اساسِ اسلام

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
(ایم اے ۔ ایل ایل بی ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی)

اساسِ اسلام

ہر نظریہ حیات ایک بنیادی عقیدے پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ اصل یا جڑ ہوتا ہے، اس جڑ میں سے جو درخت اُگتا ہے، اس میں بے شمار شاخیں نکلتی ہیں اور ہر شاخ میں سے کثیر تعداد میں پتے نکلتے ہیں۔ یہ اصل ثابت اور قائم ہوتی ہے۔ شاخیں اور پتے سوکھتے اور جھڑتے ہیں، ان پر خزاں اور بہار کا عمل ہوتا ہے۔ فروع میں یہ تجدد اور تغیر درخت کی حیات کے بقا اور ارتقا کا باعث ہوتا ہے۔ روحانی زندگی کو بھی قرآن کریم نے ایک درخت ہی سے تشبیہ دی ہے۔ جس کی اصل ثابت رہتی ہے اور اس کی فروع زمین سے لے کر آسمان تک پھیلتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کلمہ طیبہ کیا ہے، جو اس طرح کا ثبات و دوام رکھتا ہے۔ یہی کلمہ اصل دین اور اصل اسلام ہوگا۔ یہی وُہ حقیقتِ حیات ہوگا جس سے تمام ہستی کی توجیہ ہو سکے اور جو وجودِ حقیقی اور ارتقائے حیات کا ضامن بن سکے، یہ کلمہ ایسا ہونا چاہیئے جس کا عقیدہ عقل اور فطرت اور مشاہدے کی شہادت سے استوار ہو جو کسی فرد کا تصور یا وہم نہ ہو جس پر یقین کرنے کے لئے کورانہ اعتماد کا تقاضا نہ کیا جائے جو فطرت کی گہرائیوں میں سے اُبھرے اور فطرت کے مناظر و حوادث ہر قدم پر اس کی توثیق کرتے رہیں۔ فطرت کے تمام تقاضے اس سے بطریقِ احسن پورے ہو سکیں یہ عقیدہ ہر قسم کی حکمت کی اساس ہو، تمام مسائلِ حیات کی گتھیاں اُس سے سُلجھ سکیں۔ حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی یا علم اور اخلاق کے اصُول اس سے مستنبط ہو سکیں، زندگی کی لامتناہی کثرت اس ایک کلمے کی وحدت میں پروئی جا سکے وُہ کلمہ زندگی کے اوراقِ پریشاں کا شیرازہ بند ہو، اس کے اندر جو حقیقت مضمر ہو

وُہ حیاتِ جسمانی، حیاتِ مادّی، حیاتِ اخلاقی اور حیاتِ رُوحانی سب پر حاوی اور سب میں جاری و ساری ہو۔

از رُوئے اسلام یہ عقیدہ یا کلمۂ طیبّہ توحید ہے۔ قرآن نے اسی کو اصلِ دین قرار دیا ہے۔ دین کے باقی تمام ارکان، تمام شریعت، تمام شعائر، تمام عبادات تمام اصولِ معاش اور عقائدِ معاد اِس ایک عقیدے کی شاخیں اور پتّے ہیں۔

شرائع میں اختلاف اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ عبادت کے طریقے کم و بیش مختلف ہو سکتے ہیں، اخلاقی اُصول کے ہنگامی اطلاق میں اضافی تغیّر ہو سکتا ہے۔ سیاست کے انداز حالات کے تغیّر کے ساتھ بدل سکتے ہیں لیکن اس کلمہ طیبّہ اور اس اصل ثابت میں کوئی بنیادی تغیّر نہیں ہو سکتا۔ تمام قرآن شرک کے خلاف ایک مسلسل جہاد اور توحید کے دلائل کی تکرار ہے قرآن کی تعلیم یہ ہے، کہ اگر یہ عقیدہ کسی کے دل میں اچھی طرح گھر کر جائے، تو وہ حقیقتِ حیات سے آشنا ہو جاتا ہے۔ باقی تمام ثانوی حقائق ایک منطقی لزوم کے ساتھ اس میں سے خود بخود سرزد ہونگے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے علاوہ اس کی تائید میں بعض صحیح احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، کہ رسول کریمؐ اسی عقیدے کو بنیادِ دین اور عین دین سمجھتے تھے۔ اِس ضمن میں دو احادیث خاص طور پر روشنی ڈالتی ہیں، ایک کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں، کہ رسول کریمؐ نے ان کو اپنی نعلین مُبارک دیں۔ اور فرمایا، کہ جاؤ اس کا اعلان کر دو کہ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اُس کی نجات ہو گئی۔ دُوسری حدیث یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت ابوذرؓ سے کہا، کہ من قال لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَدَخَلَ الْجَنَّۃَ جس نے توحید کا اقرار کیا کہ خُدا کے سوا کوئی دُوسرا معبُود نہیں، وُہ جنّت میں داخل ہو گیا۔ ابُوہریرہؓ کے سپرد کردہ پیغام کے عوام تک پہنچانے میں حضرت عمر فاروقؓ حائل ہوئے۔ اور دُوسری حدیث میں ہے، کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو اس تعلیم نے جھنجوڑ دیا، واضح یہ نہیں تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نعوذ باللہ اس کو درست نہ سمجھتے تھے۔ ان کو فقط یہ خطرہ ہُوا کہ عوام میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھینگے کہ

لا اِلٰہ الا اللہ کہا اور چھٹی ہوگئی محض اقرار باللسان کو کافی اور مکتفی سمجھ لینگے، اور اسلام جو نظام اخلاق اور ضابطہ شریعت قائم کرنا چاہتا ہے، اس کو اختیاری یا غیر ضروری سمجھ کر اس کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔ اگر توحید اقرار باللسان سے تصدیق بالقلب تک جا پہنچے، تو اس شخص کی نظر میں اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کے عمل میں بھی ضرور ایک حیرت انگیز انقلاب ہوگا۔ اور پوری اسلامی زندگی خود بخود اس میں سے شاخوں اور پتّوں کی طرح پھوٹ پڑے گی، یہ بات سرسری زبانی اقرار سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ حضرت عمر فاروقؓ کو بجا طور پر یہ خطرہ محسوس ہوا، کہ سست عمل لوگ اس سے ناجائز فائدہ اُٹھائینگے۔ اور ممکن ہے۔ کہ بعض بدعمل لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو جائیں، کہ توحید کا اقرار ہمارے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائیگا۔
اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ کی مصلحت بینی پر رسول کریمؐ معترض نہیں ہوئے۔ حضرت ابوذرؓ کو یہ اعلان سُن کر ایک دوسری طرح کا دھکا محسوس ہوا۔ وہ بجا طور پر اخلاقی عمل کو عقیدۂ توحید سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، اُنہوں نے براہِ راست رسول کریمؐ سے دو کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا اور پوچھا، کہ توحید کا اقرار کرنے والا، اگر چوری کرے یا زنا کا مرتکب ہو، تو کیا پھر بھی اس کی نجات ہو جائیگی۔ اس پر رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ہاں پھر بھی ہوگی، یہ جواب سُن کر حضرت ابوذرؓ اور زیادہ پریشان ہوئے۔ دوبارہ پوچھا، پھر جواب ملا کہ ہاں، تیسری دفعہ پھر اپنے شک کو اضطراب کے ساتھ دہرایا، جس پر رسول اکرمؐ نے کسی قدر ناراض ہو کر فرمایا، کہ ہاں حقیقت یہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں۔ علیٰ رغم انف ابی ذرؓ

جس طرح حضرت ابوذرؓ اس سے پریشان ہوئے اسی طرح اکثر مومن آج تک اس سے مضطرب ہوتے ہیں، ہمارے نزدیک اس کی سادہ توجیہ یہی ہے کہ از روئے تقاضائے بشریت کسی وقت ایک موحد سے بھی معمولی کوتاہیوں سے بڑھ کر بڑے گناہ بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ تمام موحدوں اور مومنوں کا ایمان اپنی قوت اور بصیرت کے لحاظ سے ایک درجے کا نہیں ہوتا۔ انبیاء اور اولیاء سے چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں

اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، کیونکہ خطا و نسیان بشریت کا تقاضا ہیں، لیکن ان کی روحانی بلندی اور استقامت کی وجہ سے کبائر اثم کا سرزد ہونا ان کی فطرت کے لئے ایک امر محال ہو جاتا ہے، عام موحدوں کا درجہ اس سے بہت پست ہوتا ہے اس حدیث میں یہ نہیں ہے۔ کہ عادی سارق اور عادی زانی نجات یافتہ ہو سکتے ہیں، اس کا مطلب صرف یہ ہے، کہ کبھی کبھار ایک مومن موحد سے بھی اس قسم کی لغزش سرزد ہو سکتی ہے۔ اگر وہ واقعی مومن ہے، تو وہ پشیمان اور تائب ہوگا، خدا کے ہاں سچی توبہ کی قبولیت کا وعدہ ہے۔ اس قسم کی عارضی لغزش سے اس شخص کی سیرت مستقل طور پر خراب اور تاریک نہیں ہوگی۔ جس کی سیرت میں توحید سرایت کر چکی ہے، وہ خدا کی رحمت سے بہرہ اندوز ہے۔ توحید سے انسان کی طبیعت میں ایک فطری راستی پیدا ہو جاتی ہے۔

سیدھی نرم لکڑی کو خارجی دباؤ سے عارضی طور پر تھوڑا بہت جھکا سکتے ہیں لیکن جب وہ دباؤ ہٹ جائے، تو وہ خود بخود اپنی اصلی راستی پر واپس آ جاتی ہے۔ غفران اور رحمت اچھی سیرت ہی پر عمل کر سکتے ہیں۔

مذکورہ صدر احادیث کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے، کہ اسلام عقیدہ توحید کو اصل دین قرار دیتا ہے اور اس عقیدے کی اہمیت کو تمام دیگر اعمال کے مقابلے پر زیادہ اساسی تصور کرتا ہے۔ تمام رسالت اسی عقیدے کی توضیح اور تقویت کا ذریعہ ہے۔

توحید اور حکمت

قرآن کریم اپنے آپ کو حکمت کی کتاب قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ حکمت سب سے بڑی نعمت ہے۔ مَن یُوتَ الحِکمَۃَ فقد اوتی خیرًا کثیرًا۔ نبیؐ کو بھی یہ حکم دیتا ہے۔ کہ انسانوں کا تزکیہ نفس کر ان کو یہ کتاب پڑھ کر سنا اور سمجھا، اور اس تعلیم میں جو حکمت ہے، اس کو بھی اُن پر آشکار کر، اب غور طلب بات یہ ہے، کہ حکمت کیا چیز ہے، اور توحید کے عقیدے کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے، بعض اور الفاظ بھی ہیں، جو لفظ حکمت کے قریب قریب

مرادف شمار ہوتے ہیں۔ علم معرفت یا عقل اور اہلِ مغرب کے ہاں سائنس کی اصطلاح۔ مغربی حکیمانہ اندازِ فکر کو سائنٹفک کہتے ہیں۔ علم و عقل کہیں یا حکمت اور سائنس دیکھنا یہ ہے کہ یہ کس اندازِ تفکر کا نام ہے، کیا یہ کوئی نظری میلان یا جبلّی پیاس ہے اس کی ماہیئت کیا ہے اس کا مقصود کیا ہے، اس کے اندر کیا بات ہے جس کی وجہ سے دین اس کو خیر کثیر کہتا ہے۔ قرآن کریم طرح طرح سے اس کی تلقین کرتا ہے کہ تدبر و تفکر اور تعقل سے کام لو۔ عقل سے کام نہ لینے والوں کو، جانوروں سے پست درجہ دیتا ہے، ان کو گونگے بہرے اور اندھے کہتا ہے۔ مشاہدہ کائنات پر بڑا زور دیتا ہے۔ اسلام اس کا قائل ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اس میں تمام حوادث آئین کے زیرِ نگین، علّت اور معلول کی کڑیاں ہیں، کوئی واقعہ عبث یا باطل نہیں ہوتا۔ جس کو محض اتفاق کہتے ہیں اس کا وجود کہیں کائنات میں نہیں مشیت الٰہی اور حکمت الٰہی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اسلام سے قبل تمام مذاہب نے خوارق عادت یا معجزات و کرامات کو خدا کی خدائی اور رسولوں کی رسالت کی حقانیت کا واحد ثبوت سمجھ لیا تھا۔ اور یہ عقیدہ قائم کر لیا تھا کہ دین اور حکمت دو الگ الگ بلکہ متضاد چیزیں ہیں، دین کا تعلق مشاہدے اور عقل سے نہیں بلکہ بعض اَن دیکھی باتوں کو محض اعتبار پر مان لینا ہے۔

یہ تعلیم تمام ادیان میں سب سے پہلے اسلام نے دی کہ فطرت کا مدار سنت اللہ پر ہے اور سنت اللہ میں کوئی تبدّل و تغیر نہیں ہوتا۔ فطرت کے ثابت و قائم قوانین ہی سنت اللہ ہیں لیکن فطرت اللہ اتنی ہی نہیں ہے، جتنی حواس کو محسوس ہوتی ہے یا عقل جزوی یا عقل منطقی کی گرفت میں آتی ہے۔ اگر فطرت اللہ لامحدود ہے تو ہژدہ ہزار عالموں میں بھی کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جس کو فوق الفطرت کہہ سکیں، ہماری محدود فطرت اور محدود نظر کے لئے تو حاضر کم ہے اور غائب زیادہ، حاضر محدود ہے اور غائب لامحدود۔ لیکن خدائے بصیر و علیم کے ہاں تو سب کچھ حضور ہی حضور ہے ظلمت کہیں نہیں نور ہی نور ہے۔ جو غیب ہمارے لئے غیب ہے وہ خدا کے لئے ازلی اور

ابدی طور پر حاضر ہے ۔ تمام فطرت لامتناہی ایک خدائے واحد کی شان کا مظہر ہے
فطرت میں ہر چیز کا ہر دوسری چیز کے ساتھ براہِ راست یا بالواسطہ ربط ہے ۔

انسان کی عدم معرفت اور تنگ نظری نے جب فطرت کا مشاہدہ کیا، تو اس کو حوادث کی کثرت نظر آئی، ان حوادث میں ان کو کوئی باہمی ربط نظر نہ آیا، وہ آگ کو ایک الگ حقیقت سمجھا اور پانی کو الگ، ہر واقعہ کو کسی ایک قادر مگر متلون ہستی کے ساتھ منسوب کر دیا تینتیس ۳۳ کروڑ عناصر و مظاہر و حوادث کے تینتیس ۳۳ کروڑ دیوتا بنا ڈالے اور یہ دیوتا بھی کوئی منظم جماعت نہ تھے ۔ دیوتا ایک دوسرے سے حسد اور بغض رکھنے والے، ایک دوسرے سے متصادم اور برسرِ پیکار اور ان سب کے مقابلے میں انسان حقیر اور بے اختیار ۔ اشرف المخلوقات اسی شرک کی وجہ سے احسن تقویم کے مرتبے سے اسفل السافلین کے قعرِ مذلت میں جا گرا ۔ جس کو خلیفۃ اللہ علی الارض بننے کے لئے خلق کیا گیا تھا، اور جسے شمس و قمر اور شجر و حجر کی تسخیر کا کام سپرد کیا گیا تھا وہ خود ہی بے طرح مسخر ہو گیا، جسے حکمت و رحمت کی بنا پر خوف و حزن سے بالاتر ہونا تھا وہ ہر چیز کے سائے سے کانپنے لگا، موہوم دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنی قربانی کرنے لگا ۔ جو جانوروں کا گوشت کھانے سے راضی نہ ہوتے تھے، ان کو اپنے بھتیجے بیٹوں کا گوشت کھلانے لگا ۔ جہالت سے شرک پیدا ہوا، اور شرک سے مزید جہالت اور جہالت و شرک نے مل کر اس کو ظالم بھی بنا دیا اور مظلوم بھی ۔ اپنے اوپر ظلم کرنا دوسروں پر ظلم کرنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ شرک سے اس نے اپنے اوپر ظلمِ عظیم کیا ۔ اور اس ظلم نے اس کو کمال درجے کا ظالم بنا دیا خلیفۃ اللہ علی الارض بننے کی صلاحیت تھی الانسان ظلوماً جہولاً ہو کر خذلان و خسران میں دستِ افسوس ملتا رہ گیا ۔

انسان میں حکمت وہاں سے شروع ہوئی جہاں اس نے حوادث کی کثرت کو قوانین کی وحدت میں منسلک کرنا شروع کیا ۔ عقل کا کام یہی ہے، کہ وہ علت کو معلول کے ساتھ وابستہ کرے، اور حوادث کے باہمی روابط کا پتا چلائے ۔ عقل کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ ہر جزو کو کسی کل کے ساتھ وابستہ کرے، جزئیات سے کلیات تک پہنچے اور پھر

کلیات سے جزئیات کو اخذ کرے عقل کا یہ کام یا حکمت کا یہ سفر تب تک ختم نہیں ہو سکتا، جب تک کہ تمام جزئیات کلیات میں منسلک نہ ہو جائیں اور تمام کلیات ایک کُل میں جا کر ختم نہ ہوں، جو کُل جزئیات سے پہلے بھی ہے، جزئیات کے اندر بھی ہے، اور جزئیات کے بعد بھی۔

حکمت کُلی یا معرفت تام اس کا نام ہے، کہ جو کُل اوّل میں مصدر وجود قرار دیا جائے وہی منتہائے وجود بھی ہو۔ ہر ظاہر باطن کا اظہار ہو، اور ہر باطن ظاہر کا سرچشمہ وجود۔ توحید کا دین بھی یہی ہے، اور سائنس اور حکمت بھی اسی کا نام ہے۔ عالم طبعی کی کوتاہ نظری اور خامی اتنی ہی ہے، کہ وہ قوانین یا وحدتوں کی تلاش میں اپنے دائرہ تحقیق کو مادی اور محسوس حوادث تک محدود کر لیتا ہے، ظاہر و باطن کے لحاظ سے کچھ کلیات آفاق سے حاصل ہوتے ہیں، اور کچھ کلیات انفس سے۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ انفس و آفاق دونوں کے کلیات از روئے مشاہدہ و عقل دریافت کرتے ہوئے ان سے آگے گزر کر ایسے کُل کی طرف بڑھو، جو انفس و آفاق یا ظاہر و باطن دونوں کی جزئیات اور کلیات کا ماخذ دونوں پر حاوی اور دونوں میں جاری و ساری ہے۔ قرآن حکیم فطرت کے مشاہدے پر بہت زور دیتا ہے، اور اس کو خدا شناسی کا راستہ کہتا ہے، لیکن فطرت خارجی بھی ہے اور باطنی بھی، وہ مادی اور جسمانی بھی ہے اور نفسی بھی اسی لئے یہ ارشاد ہے، کہ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ، جس سے یہ تعلیم اخذ کی گئی ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ، جس کو اپنے نفس کا عرفان حاصل ہوتا ہے، اس کو خدا کا بھی عرفان حاصل ہوتا ہے۔ توحید محض اس عقیدے کا نام نہیں ہے، کہ خدا یا معبود ایک ہے اور متعدد نہیں۔ قرآن حکیم نے توحید کے اس بنیادی عقیدے کی ضروری تشریح بھی کی ہے، اور اس ذات واحد کے صفات بتائے ہیں۔

صفات الٰہیہ خدا کی سب سے اہم اور اساسی صفت رحمت ہے۔ رحمت کے مفہوم میں رحم بھی ہے، اور محبت بھی اور فیض بھی۔ قرآن کریم بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے شروع ہوتا ہے، اور سورۂ فاتحہ کا افتتاح بھی غیطنت سے

پناہ مانگنے کے بعد رحمانیت اور رحیمیت ہی کے صفات کے اعادہ سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ربوبیت کا تصور بھی وابستہ ہے اور اگر غور کیا جائے تو ربوبیت بھی رحمت ہی کی صفت کا لازمہ ہے۔ خدا کی ذات کی طرح اس کے صفات کی کُنہ تک بھی پہنچنا دشوار ہے لیکن کائنات و حیات میں ان صفات کے جو اثرات اور معلولات ہیں ان کو انسان مشاہدہ اور تفکر سے حسبِ استعداد سمجھ سکتا ہے۔ از روئے قرآن کریم خدا کی ذات اور اس کے صفات معلوم بھی ہیں اور نامعلوم بھی، خدا ظاہر بھی ہے۔ لیکن اس کا ظہور لامتناہی شیوں رکھتا ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِی شَاْنٍ۔ تجلی میں تکرار نہیں لیکن وُہ اس کے ساتھ ہی الآن کما کان بھی ہے۔

دُنیا میں ہر چیز کا علم عملی اغراض کے لئے محدود لیکن کمال معرفت کے لحاظ سے لامحدود ہے کسی ایک ذرّے کی بھی کُنہ اور حقیقت اس طرح دریافت نہیں ہو سکتی کہ اس کے باہر اور کچھ نہ رہے۔ علیم کل خدا ہی ہے۔ مخلوق میں سے ہر ایک کو حسب ضرورت اور حسب استعداد علم ملتا ہے۔ جو علم چیونٹی کو ہے وُہ مکھی کو نہیں اور مکھی کی معرفت چیونٹی کو حاصل نہیں، مَا اُوتِیتُم مِّنَ العِلمِ اِلَّا قَلِیلًا۔ ہر مخلوق زبانِ حال سے یہی کہہ رہی ہے کہ رَبَّنَا لَا عِلمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمتَنَا۔ کسی مخلوق کو خالق کا کلی علم نہیں ہو سکتا نہ ذات کا اور نہ صفات کا، ذات کے متعلق زیادہ سے زیادہ انسان کو یہ علم دیا گیا کہ وُہ ذات واجب الوجود مطلق اور واحد ہے لیکن خدا کی ذات کی کُنہ انسانی علم سے ماورے ہے۔ ایک عظیم الشان نبی بھی یہی کہہ سکتا ہے کہ مَا عَرَفنَاکَ حَقَّ مَعرِفَتِکَ۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم   و ز ہر چہ دیدہ ایم شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر   ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

صفات الٰہیہ کے متعلق بھی انسان کا علم اس انداز کا ہے کہ وُہ صفات کے مظاہر سے ان کا کچھ اندازہ کرتا ہے، جس طرح ذات کے متعلق بس اتنا کہہ سکتے ہیں، کہ وُہ ہے۔ لیکن خدا کا ہونا کن معنوں میں ہے، اس کو کوئی شخص قیاس نہیں کر سکتا۔

انسان کے لئے ہر وجود یا مادی ہے یا ذہنی، یا زمان میں ہے یا مکان میں، یا زمان و مکان دونوں میں، اس کے علاوہ وجود کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ لہٰذا خدا کی نسبت اگر ھوالموجود کہیں یا لاموجود الا اللہ کہیں، تو یہ موجودیت کا تصور ایمانی یا وجدانی ہی ہو سکتا ہے ادراکی نہیں ہو سکتا۔ صفاتِ الٰہیہ کی بابت بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ماہیت کیا ہے، خدا علیم ہے لیکن ہستی مطلق میں علم کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے، اس کا تصور ممکن نہیں، انسان کا ہر علم جزوی ہوتا ہے، اس کے کلیات بھی در اصل جزئیات ہی ہیں، ماورائے زمان و مکان عالم کل ہستی کا علم کس انداز کا ہوگا یہ ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ لیکن خدا کے صفات کو انسان آثار و امثال سے کسی قدر پہچان سکتا ہے۔ جیسا کہ عارف رومی کہہ گئے ہیں ؎

ہیچ ماہیات اوصاف کمال　　　کس نداند جز بآثار و مثال

اسلام کا اصل اور بنیادی کام خدا کی نسبت انسانوں کے عقائد کو درست کرنا تھا

اسلام نے توحید ہی کو اصل دین قرار دیا ہے، اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ یہ اصل اگر درست رہے تو نتیجے کے طور پر تمام علم اور تمام عمل درست ہو سکتا ہے لیکن اگر یہی اصل بگڑ جائے اور فاسد عقیدوں سے شرک جلی یا شرک خفی پیدا ہو جائے تو زندگی کے تمام فروع اس اصل کے بگاڑ سے بگڑ جائینگے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ نبیوں کا کام خدا کی توحید کی توضیح و تلقین ہے، رسالت ہمیشہ سے اِسی حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ رہی ہے۔ اِسلام میں ختم نبوت کے عقیدے کی بنا بھی یہی ہے کہ آخری مرتبہ اس عقیدے کو خالص کر کے محفوظ کر دیا گیا، اس طرح سے رسالت کی جو غرض تھی وہ پوری ہو گئی، نوع انسان پر اس حجت کا اتمام ہو گیا۔ ماننے نہ ماننے کا اختیار رہے، لیکن بات صاف کر دی گئی۔

اکثر مذاہب عقیدۂ توحید کے مدعی تھے لیکن کہیں بھی توحید کا تصور جہل کی آمیزش سے پاک نہ تھا۔ ایک خدا کے ساتھ لاتعداد دیوتا موجود تھے، زندگی کا اصلی کاروبار دیوتاؤں کی متلون مرضی پر موقوف تھا۔ ایک غیر مرئی خدا کے لئے

کوئی حقیقی کام نہ تھا، عیسائیوں اور ہندوؤں میں ایک خدا کا تصور موجود تھا لیکن یہ خدا کسی ایک انسان میں مجسّم بھی ہو سکتا ہے، اسلام کہتا ہے، کہ ہر قوم میں اصلاحِ اخلاق اور صحیح عقیدہ توحید کی تلقین کے لئے نبی بھیجے گئے، جو اعلےٰ درجے کے انسان ہی ہوتے تھے، وہ نہ قادرِ مطلق تھے اور نہ عالمِ کُل۔ ان کو غیب کی اتنی ہی خبر رہتی تھی جتنی کہ خدا کی طرف سے اُن کو مِل جائے، لیکن ہندوؤں اور عیسائیوں نے اوتاروں کا تصور کر لیا، کہ دُنیا کی اصلاح کے لئے خدا کسی انسان کی صورت میں اُتر آتا ہے، بھگوت گیتا میں کرشن کی زبانی یہی عقیدہ بیان کیا گیا ہے، جسے فیضی نے اِس شعر میں ترجمہ کیا ہے۔ ؎

چو بنیادِ دیں سُست گردد بسے　　　بر آریم خود را بشکل کسے

مشرق اور مغرب میں فلسفیانہ افکار ترقی کرتے ہوئے توحید تک پہنچ گئے تھے لیکن ویدانت اور جدید افلاطونیت میں خدا بالکل وراء الوراء اور نرگُن یعنی صفات سے مطلقاً معرّا ہو گیا تھا۔ اِن دونوں فلسفوں میں خدا نہ صاحب ارادہ ہستی رہی اور نہ انسانوں یا دیگر مخلوقات سے اس کا کوئی خالقیت یا ربوبیت کا تعلق باقی رہا، یُونانی فلسفہ سقراط، افلاطون اور ارسطو تک پہنچ کر عقلی توحید کا ایک نظامِ فکر مرتب کر چکا تھا، اُنہوں نے عقلِ منطقی کو عقلِ کُل قرار دیا اور خدا محض حدتِ منطقی کا مرادف بن گیا افلاطون نے کہا کہ عالمِ ازلی عالمِ مُثل یا عالمِ تصوراتِ عقلیہ ہے تصورات ہی اعیانِ ثابتہ ہیں، اور یہ اعیانِ ثابتہ ایک عینِ ثابت سے سرزد ہوتے ہیں، تمام تصورات کا ماخذ ایک تصورِ کُلی ہے۔ جس کو علم کہتے ہیں، وہ صرف کلیات ہی کا ہو سکتا ہے، جزئیات کا علم، علم نہیں کہلا سکتا، اِس لئے کہ جزئیات کے وجود میں عدم کی آمیزش ہے۔ معدوم معلوم نہیں ہو سکتا، اس لئے خدا کو جزئیات کا کوئی علم نہیں خدا کلیات ہی کا ایک ڈھانچہ ہے، اس کو افراد سے کوئی واسطہ نہیں، خدا خود ہی عالم ہے، اور خود ہی معلوم۔ خدا کو اپنے سوا اور کسی چیز کا علم نہیں، اس لئے کہ خدا کے باہر ماسوا کا وجود ہی حقیقی نہیں۔ اِس قسم کا خدا فلسفیوں کے کسی کام آجائے

تو آ جائے، باقی انسان اس سے کسی قسم کا رابطہ قائم نہیں کرسکتے، نہ ایسے خدا سے زندگی کا کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اور نہ انسانی نفس کو اس سے کسی قسم کی تسکین حاصل ہوسکتی ہے، فلاطینوس کے فلسفۂ اشراق میں خدا ایک مصادرہ بن گیا، جس سے کائنات بطریق تنزّل سرزد ہوتی ہے، جو کچھ اس سے سرزد ہوتا ہے وہ بلا ارادہ سرزد ہوتا ہے، اور وہ مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھتا، یہ خدا ایسا نہیں ہے، کہ اس کو پکارو تو وہ سُنے یا اس سے کوئی عبادت یا محبت کا رشتہ قائم ہوسکے، کچھ ایسا ہی حال ویدانیت کا بھی ہے، جس نے دیوتاؤں سمیت تمام کائنات کو مایا یا وجودِ وہمی قرار دیا۔ ویدانت کی یہ ورا الورا ہستی بھی نہ خالق ہے، نہ عالم، نہ رحمان نہ رب۔ شنکر اچاریہ کے نزدیک یہ ذات نرگن یا صفات سے مُعرا ہے، ہر وجود اور ہر انفرادی نفس دھوکے کی پیداوار ہے، زندگی کا مقصد اس کو باطل سمجھ کر اس سے گریز کرنا ہے، نفوس و موجودات کے بطلان کی معرفت اصلی گیان ہے، جس کے حصول کے بعد نہ نفس باقی رہے گا، اور نہ کائنات، اس نفس کلی سے ذاتِ مطلق کا اثبات ہوجائے گا۔ فلسفوں کے علاوہ ادیان کا یہ حال تھا، کہ بُدھ مت میں خدا بالکل غائب ہوگیا، کائنات اور نفوس بے حقیقت ہوگئے، ہر قسم کی آرزو ایک دھوکا ہے، آرزوؤں کے دھوکے حیات آفرینی کرتے ہیں، اور یہ آرزوئیں عارضی طور پر مجسّم ہوجاتی ہیں، انسان کے لئے فقط ایک ہی آرزو حقیقی ہوسکتی ہے، اور وہ یہ ہے، کہ اس کی کوئی آرزو نہ رہے، آرزوؤں کے ناپید ہونے سے زندگی میں اواگون کا چکر ختم ہوجائیگا، اور وہ حالت پیدا ہوجائیگی، جسے نروان کہتے ہیں جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ نفیٔ مطلق کے بعد جو اثباتِ مطلق حاصل ہوتا ہے۔ تصوّر کے لئے وہ خود بھی ایک سلبی کیفیت ہے، جس کے متعلق کوئی ایجابی تصوّر قائم نہیں ہوسکتا۔ زندگی کا نصب العین زندگی کو الم آفریں دھوکہ سمجھ کر اس سے گریز کرنا ہے، گویا احسن لائحہ عمل یہ ہے، کہ زندگی سے ذہنی اور عملی گریز کے طریقے سیکھے جائیں ترکِ دُنیا، ترکِ عقبےٰ، ترکِ مولا، ترکِ ترک۔ بدھ مت کا نظریۂ حیات اس مصرعہ

سے بہتر چند الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا، باطل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں حق سے بھی نجات حاصل ہو گئی۔ ؎

رندے دیدم نشستہ بر روئے زمین — نہ کفر، نہ اسلام، نہ دُنیا و نہ دین
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقین — در ہر دو جہاں کرا بود زہرہ ایں

کائنات بھی معدوم، دیوتا بھی مفقود، آرزوؤں کا صفایا، نصب العینِ حیات اور ہر چیز سے بے تعلقی، ہر شے سے نجات، نہ کوئی مقصود، نہ معبود، نہ تلاشِ بہبود۔ رہبانیت ترقی کرتے ہوئے کامل نفیٔ حیات تک پہنچ گئی۔

نصرانیوں نے مسیح علیہ السّلام کی تعلیم کو عجیب طریقے سے مسخ کیا، وہ مسیح جو اپنے لئے نیک کا لفظ بھی استعمال نہیں کرانا چاہتا تھا۔ جب اس کو کسی نے اچھا کہا تو اس نے جواب دیا کہ اچھا تو میرا آسمانی باپ ہے)۔ اس برگزیدہ بندۂ خُدا کو غلط اندیش پرستاروں نے خُدا کا شریک بلکہ عین خُدا بنا دیا۔ یہ توحید کی تعلیم دینے والا تثلیث کا شکار ہو گیا، اور اقانیم ثلاثہ میں سے ایک اقنوم بن گیا۔ پہلے اس کو خُدا کا بیٹا بنایا پھر بیٹے اور باپ کو ہم ذات بتایا، پھر اس خُدا کو تمام جہاں کا کفارہ بننے کے لئے مصلوب ہو کر لعنت کی موت مرنا پڑا۔ خُدائے رحیم اپنی رحمت اور ربوبیت کا اظہار اس سے بہتر طریقے سے نہ کر سکا۔ دیوتاؤں کو انسانی قربانی سے خوش کرنے کا عقیدہ ہزارہا برس سے توہم پرست انسانوں میں راسخ ہو چکا تھا، عیسائیت میں توحید اسی دورِ وحشت کی طرف عود کر گئی۔ مسیح رحمت بن کر آیا تھا، لیکن اس کے پیروؤں نے اس کو ایک غیر عادل اور ظالم خُدا کا نمائندہ بنا دیا، خُدا کے رحیم ہونے کا دعوٰے اس کے اعمال سے باطل کر دیا گیا۔ آدمؑ کا گناہ موروثی ہو گیا، جو انسان پیدا ہو گا وہ ناکردہ گناہ مجرم پیدا ہو گا، خُدا کو ذلیل کرنے کے بعد عیسائیت نے انسان کو ذلیل کیا یہ جُرم کسی نیکی سے نہیں دھل سکتا، حُسنِ عمل نجات کے لئے کارگر نسخہ نہیں، خُدا نے ایک طرف معصوم مسیحؑ کو بھینٹ چڑھایا اور دُوسری طرف یہ حکم دے دیا، کہ کسی کے نیک اعمال کام نہیں آ سکتے، جب تک کہ کوئی شخص اس پر ایمان نہ لائے، کہ مسیحؑ کی

صلیبی موت اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گئی ہے۔ یہ ایمان پیدا کر لینے کے بعد بے عمل کو بھی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

ادیان اور فلسفوں کے اس مختصر بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ توحید کے عقیدے کے بغیر یا توحید کے عقیدے کو مسخ کرنے سے کس طرح زندگی کے متعلق تمام تصورات مسخ ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے توحید کو اصل دین قرار دیا ہے۔ اگر یہ عقیدہ درست ہو جائے، تو عبادات بھی درست ہو جاتے ہیں اور معاملات بھی۔ جس کا رابطہ خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے، اس کے نظریات اور اخلاقیات خود بخود بطور نتیجہ صراطِ مستقیم پر آ جاتے ہیں۔ اسلام نے توحید کو اس قدر خالص کر دیا کہ اس سے زیادہ خالص کرنا ممکن نہیں۔

توحید ہی سے سرزد ہونے والا اسلام کا بنیادی عقیدہ جس سے باقی تمام عقائد اور اعمالِ صالحہ بطور نتیجہ حاصل ہوتے ہیں، یہی ہے کہ یہ کائنات مہمل اور بے مقصود نہیں ہے، یہ کائنات مایا نہیں باطل نہیں کھیل تماشا نہیں۔ خدا کی قوتوں اور نعمتوں کے خزانے لامحدود ہیں، لیکن وہ ہر شے کو ایک معین اندازے سے خلق کرتا ہے، کائنات کی ہر چیز میں ایک صنعت ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک صانع ہے۔ اس میں حسن و جمال ہے۔ جو اس پر دلالت کرتا ہے، کہ اصل ہستی خلاق و جمیل اور جمال پسند ہے۔ اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی آئین کے ماتحت ہوتا ہے، کوئی واقعہ اتفاقی یا بے علت ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اسلامی عقیدے کے مطابق کوئی ہستی بے جان نہیں۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ زبانِ حال سے صانع کا تسبیح خوان ہے۔ خواہ ہم اس تسبیح کو نہ سمجھ سکیں۔

ع

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند   با من و تو مُردہ با حق زندہ اند

طبقاتِ وجود میں ہر طبقہ اپنا مخصوص آئین اور مخصوص نظام رکھتا ہے۔ آئین و نظم عقل کے مظاہر ہیں، اس لئے کہہ سکتے ہیں، کہ مادی اجسام میں بھی ایک قسم کی عقل ہے جسے ہم اپنے مقابلے میں لاشعوری عقل کہہ سکتے ہیں۔ اجرامِ فلکیہ اپنے مداروں میں

نہایت حساب سے گردش کرتے ہیں کلٌّ فی فلکٍ یسبحون۔ کسی کی مجال نہیں، کہ وہ بے حساب آگے پیچھے ہو جائے۔

اسلام سے قبل عقلیت اور روحانیت دونوں غلط راستوں پہ پڑ گئی تھیں معقولات اپنی تجرید میں موجودات سے بے تعلق ہو گئے تھے، اور افلاطون کی طرح یہ نظریہ قائم کر لیا گیا تھا۔ کہ معقولات لطیف ہیں اور موجودات کثیف لہٰذا کثیف کو چھوڑ کر لطیف کی طرف صعود کرنا چاہئے۔ اسی نظریہ کے ماتحت جسم کو روح کا زندان قرار دیا گیا۔ جسم کو گھلانا روح کی پرورش کرنے کے لئے لازمی ہو گیا، عقلیت اور روحانیت دونوں کا رُخ رہبانیت کی طرف ہو گیا ادیان اور فلسفوں نے زندگی کے خلاف بغاوت کر دی، مادہ اور مادی کائنات، جسم اور جسمانی زندگی سب مردود اور ملعون ہو گئے خالق کا مخلوق سے رشتہ منقطع ہو گیا، حکمت اور روحانیت یہی رہ گئی، کہ فرار اور گریز کی راہیں تلاش کی جائیں، بدھ مت اور عیسائیت دونوں نے دنیاوی زندگی کو ملعون قرار دیا، نسلِ انسانی کی بقا اور افزائش گنہگاری کا فعل بن گیا، روحانی شخص اس کو کہنے لگے جو کوئی کام کاج نہ کرے، بھکشو بلند درجے کا انسان بن گیا، سادھو انسان کامل ہو گیا، راہب کے لئے شادی کرنا، ناجائز ہو گیا۔ ایک مرتبہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو راہب سے ملاقات ہوئی، جو بیوی بچوں کو چھوڑ کر ہمالہ کے پہاڑوں میں چلا گیا تھا، گفتگو سے معلوم ہوا کہ کالج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ میں نے یہ ارادہ کیا، کہ تھوڑی سی بحث کر کے اس کی رہبانیت کو ایک لغو فعل ثابت کروں، چنانچہ میں نے اس سے کہا، کہ حضرت جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے، اگر سب یہی اختیار کریں، تو دنیا ہی ختم ہو جائے، اس نے جواب دیا کہ ہم یہی تو چاہتے ہیں، اس سے بہتر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے، کہ یہ دنیا جو سراسر دھوکا ہے ناپید ہو جائے۔

دیگر مذاہب والے بعض اوقات پوچھتے ہیں، کہ اسلام دنیا میں کیا نیا تصور لایا، اس کا جواب سادہ اور سہل ہے، اسلام نے کائنات کو حق اور زندگی کو نعمت قرار دیا۔ کچھ نعمتیں خدا کی ربوبیت مہیا کر دیتی ہے، اور کچھ اور نعمتوں کو سعی و عمل

کا نتیجہ شمار کرتی ہے، زندگی میں جو رکاوٹیں نظر آتی ہیں، وُہ انسان کی مشقِ ارتقا کے لئے پیدا کی گئی ہیں، زندگی کا مقصد عرفان اور سیرت سازی ہے، کوئی مشکل یا مصیبت شرِ محض نہیں، خُدا خیرِ مطلق ہے، اس لئے وُہ شرِ مطلق کا آفریدگار نہیں ہو سکتا۔ مشیئت کا اصول یہ ہے، کہ خُدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما درآں باشد۔ نظرِ عارف اور عملِ صالح ایک اکسیر ہے، جو ادنےٰ کو اعلےٰ اور شر کو خیر میں تبدیل کر سکتی ہے موت اور حیات ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ان میں کوئی تضاد اور تناقص نہیں، اگر کوئی شخص زندگی کے آئین سے آشنا ہو جائے، تو وُہ ہر زحمت کو رحمت میں تبدیل کر سکتا ہے، اور موت کو زندگی میں بدل سکتا ہے، آئینِ ہستی یہی ہے، کہ ہر قدم پر فنا سے بقا حاصل ہوتی ہے، رہبانی مذاہب اور فلسفوں کو زندگی سراسر زحمت دکھائی دی اور وُہ پکار اُٹھے، کہ ؎

یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

بعض نے کہا نہیں یہ ایسی لعنت ہے، کہ سر جائے اور جان جائے تو بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہ ہو، جب تک کہ اس سے چھٹکارے کا کوئی خاص نسخہ ہاتھ نہ آئے۔

؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

کسی نے کہا، کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے، کہ اگر ایمان یا صحیح زاویۂ نگاہ اور صبر کی صفت نہ ہو، تو زندگی گھاٹے ہی کا سودا معلوم ہو گی۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

فطرتِ خارجی کا بنانے اور چلانے والا خود خُدا ہے، وُہ اِس میں نظم و آئین بھی پیدا کرتا ہے، اور حُسن و جمال بھی، وُہ براہِ راست اس کی بقا اور ارتقا کا ضامن ہے، لیکن انسان جس کو اس دُنیا میں خُدا کا نائب بنانے کے لئے بھیجا گیا ہے

اس کے متعلق ایک دوسرا آئین ہے، جس ہستی کو قدرت مطلقہ سے سب سے زیادہ بہرہ اندوز بنانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس کو شروع میں سب سے زیادہ بے بس بنایا جاتا ہے۔ تمام حشرات الارض پیدا ہوتے ہی اپنی زندگی کے خود کفیل ہو جاتے ہیں۔ انسان کے بچے کی مدتِ دراز تک یہ حالت ہوتی ہے، کہ اگر بروقت اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو وہ زندہ نہ رہ سکے، انسان کو مسخر کائنات اور قاہد علی الفطرت بنانا مقصود ہے، اس لئے اس کا وظیفۂ حیات یہ ہے، کہ وہ خود اپنی تقدیر کا معمار بنے اس سے کم تر مخلوق کی تقدیر کلیتاً خدائے قادر کی ساختہ پرداختہ ہے، انسان کو عقل اور اختیار اور غیر معمولی صلاحیتیں عطا کر کے یہ حکم دیا گیا کہ وہ اِن کے صحیح استعمال سے ہر مسِ خام کو کندن بنا تا جائے، اگر اس کی نگاہ درست نہ ہوئی اور اس کا عمل صحیح نہ ہوا، تو وہ کالانعام بل ھم اضل درجۂ حیات میں جانوروں سے بھی پست تر ہو جائیگا۔ اور اگر ایمان اور عملِ صالح کی اکسیرِ حیات سے کام لیگا تو خدا کی نیابت میں کائنات کا حکمران اور مسجودِ ملائک ہو جائے گا۔ انسان کے لئے زندگی خوانِ نعمت بھی ہے، اور میدانِ جہاد بھی، اگر اس نے جدوجہد سے گریز کیا اور زندگی کی رکاوٹوں کو دیکھ کر آنسو بہانے لگا، تو کوئی نعمت بھی اس کے لئے نعمت نہ ہو گی۔ غلط روحانیت یا رہبانیت جدوجہد سے گریز کرنے سے پیدا ہوئی، لیکن مشکلات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے سے مشکلات رفع نہیں ہو جاتیں، بلکہ اور بدتر صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

رہبانیت حقیقت میں یاس اور قنوط کی پیداوار ہے، کمزور انسان جذبات کی کشاکش اور زندگی کی پیکار کو دیکھ کر ہر قسم کی بھلائی سے مایوس ہو گیا، اس نے زندگی سے گریز کر کے سیدھا خدا کی طرف بڑھنا چاہا، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ قربِ الٰہی اور رجعت الی اللہ کا حق ادا نہ کر سکا، کیونکہ اس کا زاویہ نگاہ زندگی اور خدا دونوں کے متعلق غلط تھا، اس کا مقصود غلط نہ تھا، لیکن حصول کا راستہ غلط تھا، جس کو اس نے صراطِ مستقیم سمجھا وہ ایک پر پیچ بھول بھلیاں تھا گمراہی

سے اس کا راستہ اور طویل ہو گیا۔ بس کہ دراز او فتد جادہ نگم راہیم۔

یہ صحیح ہے، کہ کوئی مذہب بھی جس میں قنوط ہی قنوط ہو، فطرتِ انسانی کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، اس لئے رہبانی مذاہب نے اکثر یہ کیا کہ اس دُنیا اور اس زندگی سے تمام اُمیدیں منقطع کر کے ان کو حیات بعد الموت یا کسی کیفیت ماورائے حیات کے ساتھ وابستہ کر دیں، جس سے ایک طرح کی آخرت پرستی پیدا ہو گئی۔ اسلام موجودہ زندگی سے اعلیٰ تر زندگی کا منکر نہیں ہے لیکن اعلیٰ درجات ادنےٰ درجاتِ حیات کا حق ادا کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے، اسلام، ترکِ دُنیا کا نام نہیں، بلکہ دُنیا کو دین بنانے کا نام ہے، اسلام نے عبادت کا مفہوم بدل دیا، دیگر مذاہب میں عبادت ایک مخصوص فعل بن کر رہ گیا تھا، جسے پُوجا پاٹ کہتے ہیں، دیوتاؤں یا خُدا کے سامنے کچھ بھینٹ یا نذر نیاز پیش کرنا، یا ان کو خوش کرنے کے لئے معینہ منتر یا دعائیں پڑھنا۔ اسلام نے عبادت کے مفہوم کو وسیع کر کے تمام حیاتِ طیبہ کا ہم معنی بنا دیا۔ دین کا مفہوم واضح اور معین کرنے کے ساتھ ہی خود بخود عبادت کا مفہوم بھی معین ہو گیا، اسلام میں دین اور فطرت اللہ ہم معنی ہیں۔ تمام موجودات خُدا کی فطرت اور اس کی سنت کی آئینہ دار ہے ازلی اور ابدی ہونے کے لحاظ سے اس کے آئین میں تبدیلی نہیں ہوتی، اس فطرت میں تلوّن نہیں ہے، فطرت اللہ کا سب سے بڑا مظہر، انسان ہے، فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ذالک الدین القیم کسی مذہب یا فلسفے میں دین کی اس سے بہتر تعریف نہیں مل سکتی، کوئی کہتا ہے، کہ دین ان عقائد کا نام ہے جن کا کوئی ثبوت مشاہدے یا عقل سے نہیں مل سکتا کوئی کہتا ہے کہ دین فطرت سے گریز کرنے کا نام ہے، اسلام کہتا ہے، کہ دین عین فطرت ہے اس لحاظ سے کائنات میں کوئی چیز بھی بے دین نہیں ہے، شجر و حجر کا بھی دین ہے اور شمس و قمر کا بھی دین، تمام کائنات دین پر قائم ہے، ستاروں کا اپنے مداروں میں حساب سے چلنا ستاروں کا دین ہے، اور یہ حکم برداری ان کی عبادت ہے۔ ؎

گر چرخ فلک گردی سر بر خطِ فرمان نہ — در گوئے زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو

دیگر مذاہب میں یہ ہوا، کہ عبادت کا مفہوم تنگ کر دینے کی وجہ سے فقط خاص قسم کے مذہبی اعمال کو عبادت سمجھ لیا گیا۔ خاص خاص ایام اور اوقات اور خاص خاص طریقے اس کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔ کچھ لوگ ان طریقوں کے ماہرین قرار دیئے گئے، وہ پیشہ ور مذہبی گروہ بن گئے، ان پیشہ ور پیشواؤں کی مدد کے بغیر عام لوگ مخصوص عبادات بھی ادا کرنے کے مجاز نہ رہے۔ برہمنوں کے سوا وید کوئی نہ پڑھ سکتا تھا، نیچی ذات والوں کے لئے مذہب میں یہ دخل اندازی اور یہ اجارہ شکنی جرمِ عظیم بن گیا، جس کے لئے بڑی عذاب دہ سزائیں تجویز کی گئیں۔

عبادت ایک مخصوص تکنیک بن گئی، جو ہر شخص کے بس کی بات نہ رہی پیشہ ور پروہتوں کو یہ خطرہ ہوا، کہ اگر لوگ آزادانہ طور پر دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے لگے، تو مذہبی پیشواؤں کا تفوق زائل ہو جائیگا۔ اسلام نے معبود کو بلاواسطہ عابد کے قریب کر دیا، عابد و معبود کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہی۔ اسی طرح اسلام پہلا دین ہے، جس نے عبادات مخصوصہ کے لئے بھی کسی معبد یا عبادت گاہ کو لازم قرار نہیں دیا۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا، کہ ہمارے دین کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے، کہ تمام دُنیا ہمارے لئے مسجد بنا دی گئی ہے، دُنیا کا چپہ چپہ سجدہ گاہ ہے۔ ہر قطعہ زمین جس پر سجدہ کیا جاتا ہے، وہاں کا فرش عرش الٰہی سے ملحق ہو جاتا ہے۔ جب خدا انسان کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہو گیا، تو پیشہ ور مذہبی ایجنٹوں کی ضرورت نہ رہی، جن کی مدد سے ہم خدا کا قرب حاصل کریں۔ اسلام میں نہ معبد کی ضرورت رہی اور نہ پیشہ ور عابد کی۔ اس کے علاوہ تمام اعمالِ صالحہ عبادت میں داخل ہو گئے۔ محنت سے روزگار پیدا کرنا بھی عبادت قرار دیا گیا۔ الکاسب حبیب اللہ۔ دنیا کے تمام کاموں اور تمام حرفوں اور پیشوں میں وقار پیدا ہو گیا کوئی کام فی نفسہٖ نہ ادنےٰ رہا، نہ اعلےٰ۔ جو کام اصولِ خیر حصولِ خیر اور آئینِ فطرت کے ماتحت کیا جائے، وہ اعلےٰ کام ہے، اور عبادت ہے اور بڑے سے بڑا کام اگر آئینِ الٰہی کو نظر انداز کر کے یا اس کی خلاف ورزی کر کے کیا جائے، تو وہ مردود فعل ہے۔

اسلام کا بنیادی نظریہ ہی یہ تھا، کہ دین اور دُنیا الگ الگ چیزیں نہیں ہیں دُنیا کو صحیح نظر سے دیکھنا اور اس میں حسنات کا پیدا کرنا ہی دین ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔ اسلام نے یہ گُر بتایا، کہ کس طرح تمام زندگی پر روحانیت کا رنگ یا صبغۃ اللہ چڑھ سکتا ہے، تمام طیبات انسان کے لئے حلال ہو گئے، علم و حکمت کے تمام دروازے کھل گئے، کوشش کرنے والوں کو یہ خوشخبری دی گئی، کہ صلاح و فلاح میں ساعی کو صحیح راستے بتائے جائیں گے۔ الذین جاھدو فینا لنھدینھم سُبلنا۔ حکمت کے طالب کو حکمت عطا ہو گی، جو خیر کثیر ہے، جس سے اس کو حقیقت کا عرفان اور حیاتِ طیبہ حاصل ہو گی، اسلام نے مومن کے لئے ارتقا کے تمام راستے کھول دئے، اور اس کا اعلان کر دیا، کہ دین انسانوں کے لئے تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ اسلام میں نہ عبادات میں تنگی ہے اور نہ معاملات ہیں خدا انسان سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا جو اس کی قدرت اور ہمت سے بالاتر ہو، اسلام میں ہر حکم اور ہر ہدایت کے ساتھ تخفیف اور سہولت کے پہلو موجود ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسولِ کریم نے فرمایا، کہ دو طریقوں میں سے وہ طریقہ اختیار کرو جس میں سہولت ہو بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اسلام نے جس دُنیا کو مذموم قرار دیا وہ بے دین دنیا ہے۔ جو خُدا کی طرف سے غافل ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

چیست دُنیا از خُدا غافل شدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

حقوق العباد کی ادائیگی، حقوق اللہ سے کوئی الگ تھلگ چیز نہیں، یہ تفریق محض اضافی ہے۔ جو شخص بندوں کا حق ادا کرتا ہے، وہ خُدا کا حق ادا کرتا ہے۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

صلح و جنگ اسلام کو اس کے دشمنوں نے اور نادان دوستوں نے شمشیر زنی کا مذہب قرار دیا، یہ ایک بہتانِ عظیم ہے، ایسے دین کے متعلق جس کی ماہیت اور جس کا مقصد ہی سلامتی، سلامت روی اور امن کوشی

ہے۔ اسلام کے سوا تاریخ ادیان میں کسی دین کے لئے کوئی معنوی اسم نہیں ہے، انسانوں نے ادیان کو انبیاء اور پیشوایانِ دین کے ناموں کے ساتھ منسوب کر رکھا ہے کوئی دین بُدھ مت کہلاتا ہے، کوئی عیسائیت، کوئی زرتشت کے نام کے ساتھ منسوب ہے، کوئی موسیٰ کے ساتھ۔ اسلام نے یہ اعلان کیا کہ رسولوں اور مبلغوں کے ناموں سے دینِ الٰہی کا منسوب کرنا ناجائز ہے، رسولوں کی رسالت ذریعہ حصولِ مقصد ہے۔ بذاتہٖ مقصود نہیں۔ دین ازلی اور ابدی حقیقت ہے، اور یہ سرمدی حقیقت امن جوئی ہے، انسان جب راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے، تو سب سے پہلے اس کے نفس میں خانہ جنگی شروع ہوتی ہے، ایک خواہش دوسری خواہش سے ایک جبلت دوسری جبلت سے برسرِ پیکار ہوتی ہے، انسان کی اندرونی نفسی مملکت میں عدل کی جگہ ظلم اور امن کی جگہ فساد رونما ہوتا ہے، انسان دوسروں پر ظلم کرنے سے پہلے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ اور پھر یہی داخلی ظلم خارجی ظلم کی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے، اور انسان اپنے ماحول سے مخالفت شروع کرتا ہے، جو شخص اپنے اوپر ظلم کرتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ عدل کیسے کر سکتا ہے۔ ع

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری

ایسا شخص ہر جگہ ہر حالت میں ہر انسان کے ساتھ فساد کا باعث ہوتا ہے، اسلام کا مقصدِ واحد یہی ہے، کہ نفسی و افاقی اور داخلی و خارجی فتنہ و فساد کو روکا جائے۔ قرآن کریم نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال کر دیکھا، کہ انسانی زندگی میں فتنہ و فساد کس کس راستے سے داخل ہوتا ہے، اور پھر ان تمام راستوں کو مسدود کرنے کے طریقے بتلائے ہیں، ہر قوم نے اپنے اپنے دیوتا اور معبود تراش رکھے تھے، ایک ہی قوم کے مختلف دیوتا بھی آپس میں ہم آہنگ نہیں تھے، مظاہر فطرت میں ہر مظہر کا ایک الگ رب النوع تھا، اور آپس میں وحدتِ عمل کے لئے ان میں کوئی سمجھوتہ نہیں تھا۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ کائنات ایک منظم حقیقت ہے، اس کے تمام آئین کسی مرکزی آئین سے سرزد ہوتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ موجودات میں اگر کئی خالق و ناظم ہوتے تو اس میں فساد بپا رہتا، اگر کائنات میں کثرتِ حوادث کسی وحدت میں منسلک نہ ہوتی، تو کسی چیز کا قائم رہنا

تو نہ کنار، شروع سے کوئی چیز وجود میں ہی نہ آسکتی۔

اسلام دینِ وحدت ہے، وحدت کا دوسرا نام ہم آہنگی اور صلح بین الاضداد ہے، اسلام نے سب سے پہلے انسان کے نظریہ حیات میں فساد کو رفع کر کے امن پیدا کیا۔ جن قلوب پر شرک کی حکومت ہو، ان میں حکمت بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ حکمت متضاد نما چیزوں میں غیر مرئی اور عقلی وحدت کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ از روئے حکمت شرک تمام جہالتوں کا منبع ہے، اور جہالت سے ظلم اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ توحید کی تعلیم حکمت کی تعلیم ہے، اور حکمت جہالت اور ظلم کو دور کرتی ہے، جس دین نے توحید کو اصل دین قرار دیا، اس نے اپنا نام اسلام رکھا، جس نفس میں جس قدر توحید کی معرفت ہو گی، اسی قدر اس کے اندر سلامتی ہو گی، اور عالم انفس و آفاق کے ساتھ ہم آہنگی پیدا ہوتی جائیگی، ایمان کے لفظ کا مادہ بھی امن ہے، سچا ایمان اسی کو کہہ سکتے ہیں، جو مومن کی طبیعت میں امن پیدا کرے، اور انسانوں کے بارے میں اس کو امن پسند بنائے۔

اسلام جنگ کو نہ مقصودِ حیات سمجھتا ہے، اور نہ کوئی خوشگوار فعل، جہاں تک ہو سکے وہ اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے، کسی بے گناہ کا قتل کرنا جرم عظیم ہے، احترام حیات کی تعلیم دیتے ہوئے قرآن نے چند الفاظ میں ایسا حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے، جو اس بارے میں اس کے تمام نظریۂ حیات کی وضاحت کرتا ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ او فسادٍ فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا۔ جو کوئی کسی شخص کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اس شخص نے کسی کی جان لی ہو، یا دنیا میں فتنہ و فساد پھیلایا ہو، تو اس نے اپنے اس فعل سے گویا تمام نوع انسان یا تمام انسانیت کا خون کر دیا۔ کسی مذہب، تہذیب یا تمدن کو جانچنے کا ایک معیار یہ ہے، کہ اس کی تعلیم اور اس کے عمل میں کہاں تک احترامِ حیات پایا جاتا ہے۔ اسلام نے جو جنگ کی اجازت دی ہے، وہ فتنہ و فساد کو روکنے کی غرض سے ہے، جب قتل کرنے کے بغیر فتنہ رفع نہ ہو سکتا ہو تو اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے، کہ الفتنۃ اشد من القتل۔ قتل بری چیز ہے، لیکن فتنہ اس سے کہیں زیادہ قبیح ہے، اس لئے جہاں قتل یا جنگ کے بغیر فتنہ فرو نہ ہو سکتا

ہو، وہاں نہ صرف جنگ کی اجازت ہے، بلکہ جنگ کرنا فرض ہو جاتا ہے، چونکہ صرف رفع فتنہ کے لئے جنگ کی اجازت دی گئی ہے، اس لئے یہ تاکید کی گئی۔ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ۔ رسول کریمؐ کو جنگ اس لئے کرنی پڑی، کہ کفار آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ تبلیغ کی اجازت نہ دیتے تھے، اور مومنوں کو محض اس لئے اذیت پہنچاتے تھے کہ ان کے عقائد مشرکوں کے عقائد کے مخالف ہیں، اسی مخالفت میں اُنھوں نے بڑا فتنہ بپا کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا، کہ ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین صرف اللہ کے لئے ہو، یعنی دین کی تبلیغ اور اس پر عمل کرنے کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ ہٹ جائیں۔ جنگ کی سزا فقط ظالموں کے لئے ہے، اگر وہ ظلم سے باز آجائیں، تو ان کے خلاف تلوار نہ اُٹھائی جائے۔ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ۔ جنگ کی اجازت صرف ان لوگوں کے خلاف ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دُنیا میں سرکشی کر کے فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں، ایسے لوگ عذاب الیم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ ایسے لوگ جنھوں نے اسلام تو قبول نہیں کیا، لیکن مسلمانوں سے دین کے معاملے میں جنگ بھی نہیں کی، اور نہ ان کو گھروں سے نکالا ہے، ایسے امن پسند غیر مسلموں کے ساتھ تم کو احسان اور انصاف کرنے سے خُدا نہیں روکتا، خُدا احسان اور انصاف سے محبت کرتا ہے، اور اس کا دائرہ غیر مسلم امن پسندوں تک وسیع کرتا ہے۔ لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ، اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ اِنَّمَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (الممتحنہ)

اِسلام کا بنیادی اُصول یہ ہے، کہ دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہے۔

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین ۔ رسولِ کریمؐ کی زندگی یا صحابہ کرام کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اسلام جب اپنی پوری قوّت پر تھا اور قیصر و کسریٰ کا تخت اُلٹ چکا تھا، اس وقت بھی حضرت عمر فاروقؓ جیسا مقتدر خلیفہ اپنے نومسلم غلام تک کو جبر سے مسلمان بنانے کا قائل نہ تھا۔ جب اس غلام نے نہ مانا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، کہ تمہیں اختیار ہے، دین میں جبر نہیں ہو سکتا۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین ۔ جن دشمنانِ حق نے رسول کریمؐ پر یہ تہمت لگائی ہے، کہ وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لیئے پھرتے تھے، ان کی تردید کے لیئے رسولِ کریمؐ کی زندگی کے کئی واقعات پیش کیئے جا سکتے ہیں، جن سے مذہب کے معاملے میں ان کی کمال رواداری کا اندازہ ہو سکتا ہے، یثرب میں ایک رسم تھی کہ جن عورتوں کے بچے زندہ نہ رہتے تھے، وہ منت مانتی تھیں کہ اگر میرا بچہ زندہ رہا تو میں اس کو یہودی بناؤنگی۔ اس طرح کے بہت سے بچے بنی نضیر کے گھروں میں یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ جب اسلام کو قوّت حاصل ہو گئی، تو ان بچوں کے مسلمان باپوں نے رسولِ کریمؐ سے عرض کیا کہ ہم اسلام کو یہودیت سے بہتر دین سمجھتے ہیں، اب ہم ان بچوں کو مسلمان بنائینگے، اور یہودی نہ رہنے دینگے۔ بہت سے محدثین اور مفسرین اس پر متفق ہیں، کہ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین کی شانِ نزول یہی ہے، کہ خدا نے اجازت نہ دی کہ ان بچوں کو بجبر مسلمان بنایا جائے۔ قرآن کریم میں اور بھی کئی جگہ مذہبی آزادی کو اسلام کا رتبہ قرار دیا گیا ہے، فَمَن شَاءَ فَلْیُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْیَکْفُر، جس کا چاہے مومن بن جائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔ خدا چاہتا ہے کہ لوگ مومن بن جائیں، اور اس کو یہ قدرت بھی حاصل ہے، کہ تمام نوعِ انسان کو بجبر مومن بنا دے، لیکن خدا اپنی خواہش اور قدرتِ کاملہ کے باوجود دین کے معاملے میں جبر کرنا نہیں چاہتا۔ ایمان کی اصل ہی یہی ہے کہ اس کو آزادی کے ساتھ افضل سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ جبر سے ایمان کی ماہیت ہی زائل ہو جاتی ہے، جبر سے جو کچھ حاصل ہو گا، وہ ایمان نہیں کہلا سکتا۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ

لآمن من فی الارض کلھم جمیعًا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین
اگر تیرا رب چاہتا تو تمام رُوئے زمین کے لوگ ایمان لے آتے، کیا تو لوگوں کو مجبور کریگا، کہ مومن ہو جائیں۔ خُدا یہ بھی نہیں چاہتا کہ کسی خارقِ عادت نشانی سے لوگوں کو مرعوب اور عاجز کر کے ان میں ایمان پیدا کرے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا جبر ہے، کسی معجزے سے وُہ کیفیت تو پیدا نہیں ہو سکتی، جسے ایمان کہتے ہیں۔ ایمان فقط آزادانہ حقیقت شناسی سے پیدا ہو سکتا ہے، خُدا نبی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے، کہ شاید تو اس رنج میں گھل گھل کر جان دے دیگا، کہ وُہ ایمان نہیں لاتے "اگر ہم چاہیں، تو آسمان سے ایک ایسی نشانی اُتار دیں، کہ اس کے آگے اُن کی گردنیں جھک جائیں، مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ بزور کسی کی گردن جھکانا ایمان آفرینی کا طریقہ نہیں ہے خُدا کو ایسے ایمان کی ضرورت نہیں ہے، جو معرفت سے پیدا نہ ہُوا ہو اور جس کو انسان نے خوشی سے اختیار نہ کیا ہو۔

جبر و اختیار۔ حریت و استبداد

اسی تعلیم سے جبر و اختیار کے مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ مسئلہ مسلموں اور غیر مسلموں اور حکمار شرق و غرب میں ہمیشہ سے ایک معرکتہ الآرا مسئلہ رہا ہے، قرآن میں تصویر کے دونوں رُخ ملتے ہیں، آیات کو اگر الگ الگ کر کے پڑھا جائے، تو بعض میں سے جبر نکلتا ہے، اور بعض میں سے اختیار۔ خُدا خالقِ کُل اور قادرِ مطلق ہے، اس نے تمام مخلوقات کو خلق کیا اور ہر شے کی خلقت کے قوانین بھی بنائے، جو کچھ وجود میں آیا وُہ اس کی مرضی سے وجود میں آیا، اس کی مرضی کے بغیر کوئی پتّا نہیں ہل سکتا۔ ہر عامل کو عمل کی قوت بھی خُدا ہی نے عطا کی۔ دُنیا میں اور انسانی زندگی میں بیشمار علتیں کام کرتی ہیں، اور ہر علت لازماً اپنا معلول پیدا کرتی ہے، لیکن تمام علتیں آخر میں ایک علت العلل پر ختم ہوتی ہیں، اور یہ علت العلل خود خدا ہے، لہذا جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی کڑیاں آخر میں علت العلل پر منتہی ہوتی ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے، کہ کائنات اور انسان کی عنانِ حکومت خُدا کے ہاتھ

میں ہے، لیکن اس نے انسان کو خاص دائرہ عمل میں اختیار دے رکھا ہے، اس کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دئیے ہیں، اخلاقی قانون صحیفہ قدرت اور نفس انسانی کی لوح پر مرقوم ہے، انسان کو اختیار ہے، کہ وہ ان دو راستوں میں سے جو راستہ چاہے اختیار کرے، نیکی اور بدی اور اجر و تعزیر کے آئین مقرر ہیں، اعمال انسانی بھی میزان میں اُسی اتقان اور باریکی کے ساتھ تلتے رہتے ہیں، جو اتقان کہ اجرام فلکیہ کی حرکت اور دیگر طبیعی حوادث میں پایا جاتا ہے، تقدیر کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خیر و شر کے قوانین معین ہیں، ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ انسان کو جن حدود کے اندر اختیار عطا کیا گیا ہے وہ بھی مشیت الٰہی کی بدولت ہے، اس لئے ایک لحاظ سے اس کے ہر عمل کی آخری علت مشیتِ ایزدی ہی ہے، لیکن خدا انسانوں کی اخلاقی تربیت اور ان کی سیرت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور یہ اختیار کے بغیر ممکن نہیں۔ دُنیا میں آدمؑ کی زندگی کا آغاز ہی اختیار کے استعمال سے ہوا، خدا نے اس کو شجر ممنوعہ کے قریب جانے سے منع فرمایا، آدمؑ نے اپنی عقل اور اپنے اختیار کا غلط استعمال کیا اس کے بعد پشیمان ہوا اور خدائے رحیم نے اس کو نہ صرف معاف کر دیا، بلکہ خلیفۃ اللہ فی الارض بنا دیا۔ آدمیت کا آغاز اختیار ہی سے ہے، خواہ وہ اختیار غلط ہی کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ مادیت کے فلسفے نے انسان کو مجبور محض قرار دیا، مادہ اپنے کورانہ جبر پر عمل کرتا ہے، اس کے نزدیک انسان کا جسم اور اس کا نفس بھی مادی ہے، اس لئے انسان کا ہر عمل اجرام فلکیہ کی رفتار کی طرح معین و مقدر ہے، کوئی شخص کسی حالت میں جو کچھ کرتا ہے، اس کا کرنا لازمی ہی تھا، کیونکہ مادی علتیں لزوم کے ساتھ اپنا معلول پیدا کرتی ہیں، اگر یہ نظریہ ہو، تو اخلاق بے معنی ہو جاتے ہیں، مدح و ذم کا کچھ مطلب نہیں رہتا، جو نیک ہے وہ نیک ہونے پر مجبور ہے اور جو بد ہے، وہ بد ہونے میں معذور۔ مادیت نفس کے مستقل وجود ہی کی منکر ہے اس لئے اس کے اندر اختیار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے، کہ روحانیت اور الٰہیت اور توحید کے قائلوں نے بھی جبر کا مذہب اختیار کر لیا۔ ان کا

استدلال یہ تھا، کہ چونکہ خدا علیم قادرِ مطلق اور علّت العلل ہے، اس لئے دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، اور انسان جو کچھ کرتا ہے، وہ ازل سے معین اور مقدر ہے۔ ان لوگوں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا، کہ اگر یہ نظریہ صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو دین کی تمام تعلیم و تلقین مہمل ہو جاتی ہے، دین امرِ الٰہی پر قائم ہوتا ہے، لیکن کسی مامور کو کسی ایسی بات کا امر کرنا جس کی استعداد اور قدرت ہی اس میں نہ ہو، ایک عبث بات ہے۔ مسلمانوں کی دینیات علم کلام اور ادبیات میں دورانِ انحطاط میں جبر کا عقیدہ مسلّمات میں تسلیم کیا جانے لگا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سست عمل اور بدعمل لوگوں کو ایک عذر ہاتھ آ گیا، کہ ہم کو بُرا مت کہو۔ ہم جو کچھ بھی ہیں خُدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں، اور جو کچھ ہم سے سرزد ہوتا ہے وُہ مشیت ہی کے جبر کے ماتحت سرزد ہوتا ہے۔ میر کہتا ہے، کہ ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

گویا مختاری انسان پر ایک تہمت ہے، اب انسان خُدا پر تہمت لگاتا ہے، کہ فعلِ بد کا ذمہ دار وُہ خود ہی ہے، اور خواہ مخواہ ہم بے گناہوں کو بدنام کرتا ہے، نہ صرف بدنام کرتا ہے، بلکہ اپنے کئے کی سزا ہم کو دیتا ہے۔ کرے خُدا اور پکڑا جائے انسان۔ ؎

در کوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند — گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را
حافظ بخود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود — اے شیخ پاکدامن معذور دار مارا

قرآن میں پیش کردہ اسلام نہ جبری ہے، اور نہ قدری۔ انسانی زندگی میں جبر بھی ہے اور اختیار بھی۔ ایک روایت ہے، کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے دریافت کیا، کہ انسان مجبور ہے یا مختار وُہ شخص کھڑا تھا، حضرت علیؓ نے فرمایا، کہ اپنا ایک پاؤں زمین سے اُوپر اُٹھاؤ، اس نے اُٹھایا، اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا، پھر فرمایا، کہ اس کے ساتھ ہی دُوسرا بھی اُٹھا کر کھڑے رہو، اس نے کہا کہ یہ تو ناممکن ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا، فرمایا کہ بس اسی سے جبر و اختیار کے حدود کو سمجھ لو، آئینِ فطرت یہی ہے، کہ خُدا نے انسان کو خاص حدود میں اختیار دے رکھا ہے، اس کے باہر فطرت کے

قوانین کا لزوم یا جبر عمل کرتا ہے، انسانی زندگی جبر اور اختیار کے بین بین ہے۔ انسان نہ مختارِ مطلق ہے، اور نہ مجبورِ محض۔ جن باتوں میں اس کو اختیار دیا گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی اسی حد تک ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ نفسِ انسانی آفاق کے آئین کے ساتھ وابستہ بھی ہے لیکن اپنی مستقل حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہ خاک زندہ تابع ستارہ نہیں۔ اب تو مادیت نے بھی جبرِ محض کا عقیدہ بہت کچھ ترک کر دیا ہے۔ نہ مادہ قدیم مادیین کا مادہ رہا اور نہ مادیت کا فلسفہ پہلے انداز پر قائم رہ سکا، قدیم فلسفہ زیادہ تر جبری تھا، جس کے زیرِ اثر مسلمانوں کا بھی علم کلام جبریت کا شکار ہو گیا۔ جدید فلسفے میں برگساں نے خاص طور پر غیر معمولی وجدان اور حکمت سے اس کا ثبوت مہیا کیا، کہ زندگی کی ماہیت ہی آزادانہ تخلیق ہے، اور مادہ اس کے مقابلے میں ایک پس ماندہ چیز ہے، حیاتِ تیز رو کے پاؤں پر پڑی ہوئی گرد اس کی رفتار کو معین نہیں کرتی۔ اسلام نے انسان کے وقار کو اس کے اختیار کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ جہاں اختیار نہیں وہاں اخلاقی ذمہ داری نہیں ہو سکتی، اور جو شخص اپنی زندگی اور اپنے ارادہ کا مالک نہیں ہے وہ حیوان سے بھی پست تر ہو جاتا ہے توحید اسلامی نے انسانوں کو موہوم معبودوں اور دیوتاؤں کی غلامی سے چھڑایا، اور اس کو اس کا احساس دلایا کہ اس کا منصب مسجودِ ملائک اور مسخرِ کائنات ہونا ہے، بالفاظِ دیگر اس کا وظیفۂ حیات خلافتِ الٰہیہ ہے، جو جو قوتیں انسانوں کے جائز اختیارات کو سلب کرنے والی تھیں، ایک ایک کر کے ان کا صفایا کر دیا، دیوتاؤں کے علاوہ انسان بھی انسانوں کے مالک اور رب بن بیٹھے تھے۔ غلامی اور استبداد کی تمام قسمیں پورے زور شور سے انسانی معاشرے میں عمل کر رہی تھیں۔ غلامی کی بدترین قسم ایک انسان کا دوسرے انسان کی جان، مال اور آبرو کا مالک ہونا ہے۔ یہ غلامی ہر قوم کی معاشرت کا ایک جزوِ لاینفک بن گئی تھی، شخصی اور معاشی غلامی تمدن اور معاشیات کا محور تھی، ارسطو جیسے حکیم نے بھی کہا، کہ یہ ایک فطری چیز ہے، جو منسوخ نہیں ہو سکتی، اور اسے منسوخ کرنا بھی نہیں چاہئے۔ اسلام نے اس کو

معاشرے کی ایک بیماری اور لعنت قرار دیا، لیکن چونکہ یہ مزمن مرض ہزارہا سال سے انسانیت کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا، اس لئے ایک روز میں اس کا قلع قمع کرنا محال تھا، اسلام نے اس کی تدریجی تنسیخ کا پروگرام بنایا، زیادہ تر غلامی جنگ میں اسیر ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔ اس کے متعلق یہ تعلیم دی کہ اسیرانِ جنگ کو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، یا احسان کر کے اُن کو رہا کر دو، یا جنگی اسیروں کا تبادلہ کر لو۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے روز بعض لوگ ایسے مجرم ہونگے، خدا جن کا مُنہ دیکھنا نہیں چاہیگا۔ ان میں سے ایک گروہ وُہ ہوگا جس نے آزاد انسانوں کو غلام بنایا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے غلامی کی تدریجی تنسیخ پر عمل کرنا شروع کیا، اور حکم دیا، کہ کوئی مُسلمان غلام نہیں ہوسکتا، اس کے بعد فرمان جاری کیا، کہ کوئی عرب غلام نہیں ہوسکتا بعد میں جب خلافت سلطنت میں تبدیل ہوگئی اور قیصریت اور امرائیت کا دَور دورہ ہوا تو اسلام کے اور پروگراموں کی طرح اس پروگرام پر بھی آگے قدم بڑھانا رُک گیا، اور فقیہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا، کہ غلاموں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تلقین کی گئی ہے اور ان کے حقوق معیّن کر دئے گئے ہیں، لیکن غلامی کا منسُوخ کرنا لازمی نہیں۔

اسی سلسلے میں اسلام کے متعلق ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کو واضح کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ ہر نبی کسی قوم میں آتا ہے، اور ہر نبی کسی قوم کا فرد ہوتا ہے۔ جس قوم میں کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے وُہ قوم اپنا مخصوص مزاج رکھتی ہے۔ خاص خاص روایات اور رسم و رواج اس کی معاشرت کا تار و پود ہوتے ہیں۔ نبی کا کام ان کے عادات کو درست کرنا، اور قبیح رسوم کا قلع قمع کرنا ہوتا ہے، لیکن اصلاح کا کام اس قوم کے رسم و رواج، روایات و مزاج سے بالکل قطع نظر کر کے نہیں ہوسکتا۔ مصلح کو یہ دیکھنا پڑتا ہے، کہ یہ قوم اپنی موجودہ حالت میں زیادہ سے زیادہ کتنی اصلاح کو قبول کر سکتی ہے، جس طرح فرد کی اصلاح میں تدریج برتنا پڑتی ہے، اسی طرح قوم کی اصلاح بھی بتدریج ہی ہوسکتی ہے۔ اصلاح کے متعلق مولانا حالی ایک نہایت حکیمانہ رباعی لکھتے ہیں۔

دھونے کی ہے اے ریفارمر جا باقی — کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبّا باقی
دھو شوق سے دھبّے کو پہ اتنا نہ رگڑ — دھبّا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں نبوّت کے اندازِ اصلاح پر لکھا ہے، کہ دین کے کچھ ازلی اور ابدی اصول ہیں، نبی کا کام یہی ہے، کہ ان اصولوں کو اپنی تعلیم اور اسوہ حسنہ سے دل نشین اور قابلِ یقین بنائے، لیکن ہر نبی کو اس قوم کے مزاج کا لحاظ کر کے اصلاح کرنی پڑتی ہے جس قوم میں وہ مبعوث ہوا، لہٰذا جو قاعدے نبی رائج کرتا ہے، ان میں بہت سی باتیں قومی مزاج کو مدنظر رکھ کر جاری کی جاتی ہیں۔ یہ قاعدے اور طریقے دین کا ازلی اور ابدی جزو اور اس کی ماہیت میں داخل نہیں ہوتے، جس سے یہ لازم آتا ہے کہ کسی دوسری قوم پر جس کا مزاج روایات اور طریق زندگی بالکل مختلف ہو، یہ قواعد جوں کے توں قابلِ اطلاق نہیں ہو سکیں گے۔ کسی نبی نے اصلاح کا جو قدم اٹھایا، اس کے حدود، روایات اور مزاج قومی سے متعین ہوئے، اگر اس قوم یا اس زمانے میں مزید اصلاح کی صلاحیت ہوتی تو اصلاح کا ایک اور قدم آگے بڑھایا جاتا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے اس خیال کی بخاری شریف کی ایک حدیث سے تائید ہوتی ہے، جس میں رسولِ کریمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر میری قوم ایسی جاہل نہ ہوتی، تو میں کعبے کے ایک حصّے کی تعمیر کو ابراہیمی نقشے پر بناتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس شکست و ریخت اور تجدید و تعمیر سے ان کے جاہلانہ جذبات کو دھکا لگے گا، لہٰذا میں نے اپنے ارادے کو ترک کر دیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ کتنی اصلاحی باتیں ایسی ہونگی، جن کے متعلق رسولِ کریمؐ نے سوچ سمجھ کر اتنا ہی قدم اٹھایا، جتنا کہ ان کی قوم برداشت کر سکتی تھی، قوم کی برداشت اور اس کی تہذیبی اور تمدّنی حالت سے زیادہ اصلاح کی تعجیلی کوشش نفع کے مقابلے میں نقصان پہنچا سکتی ہے، لیکن دینِ ازلی وہی ہو سکتا ہے، جو زندگی کے انتہائی نصب العین کو معین کرے، اور ہر اصلاح اس نصب العین کی طرف ایک بڑھتا ہوا قدم ہو۔ انسانی زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ وہ حسب استطاعت اخلاق الٰہیہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ تخلقو باخلاق اللہ مومن کا لائحہ عمل ہے۔

اصول و اوامر

اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ہیں، ایک اصول اور ایک اوامر قرآن کریم نے اپنا نام قرآن حکیم رکھا، جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ دراصل حکمت کی کتاب ہے، حکمت اصل اور بنیادی حقیقت ہے، اور احکام حسب ضرورت اس حکمت سے سرزد ہوتے ہیں، تاکہ وہ حکمت تنظیم حیات میں بروئے کار آسکے، قرآن نے حکمت کو موعظت پر مرجح سمجھا ہے، ادع الی سبیل ربک بالحکمت والموعظۃ۔ جس شخص میں حکمت اور امر سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، اس کے ساتھ وعظ و نصیحت سے کام لیا جاتا ہے، اور عمل کے لئے اوامر و نواہی اس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں احکام کی تعداد بہت کم ہے اور اکثر احکام کے ساتھ اس حکمت کو بھی واضح کیا ہے، جو کسی حکم کی علت ہے۔ اگر اوامر کی کثرت ہو جائے، تو انسانوں کی جائز آزادی بھی بعض اوقات محدود ہو جاتی ہے، اسلام کی غرض یہ تھی، کہ جہاں تک ہو سکے، انسان خدا کو کائنات کے مشاہدے اور مطالعے اور تفکر و تدبر سے سمجھے اور خدا کے احکام کی حکمت بھی اس پر واضح ہو۔ اسلام کی معاصر دنیا میں ادیان نے زندگی کو بہت محدود اور محصور کر رکھا تھا۔ اوامر و نواہی کی کثرت نے اصل دین کو فراموش کرا دیا تھا۔ متعصب شخص وہی ہوتا ہے جو اصل کو فراموش کر کے فرع ہی کو اصل سمجھ لیتا ہے، اور کسی حکم کی علت اور حکمت کو سمجھے بغیر اس کی ظاہری صورت کی پابندی کو عین دین تصور کرتا ہے۔ اسلام نے دین کی یہ حقیقت بتائی کہ الدین یسرٌ۔ دین آسانی کا نام ہے، اور رسالت کا مقصد یہ ہے، کہ انسانوں نے جو توہمات، روایات اور رسوم کی زنجیروں سے اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے، ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے، احکام کی تعداد کم سے کم ہو، اور زیادہ زور اصول پر دیا جائے۔ حکم کی محض ظاہری پابندی کر کے اس کے باطن اور اس کی حکمت سے غافل رہنے والوں کو تنبیہ کی جائے، عبادات کا مقصود بتایا جائے، اور ان کے کچھ ارکان اور آداب معین کئے جائیں، لیکن ساتھ ہی تاکید کے ساتھ یہ تلقین کی جائے کہ ارکان و آداب ذرائع ہیں، مقصود اصلی نہیں ہیں، نماز حقیقی وہ ہے جس میں حضور قلب ہو، اور وہ فحشا و منکر سے انسان کو روک سکے، اور انسان کی طبیعت میں اعمال صالحہ کی رغبت پیدا کر سکے، قیام و رکوع و سجود اور قبلہ رو ہونا

حصولِ مقصد کے ذرائع ہیں، اگر اصل مقصد حاصل نہ ہو، تو اُٹھنا بیٹھنا اور آیات کو طوطے کی طرح دہرانا اچھائی کی بجائے بُرائی کا باعث ہو سکتا ہے، چونکہ ارکان فی نفسہٖ مقصود نہیں ہیں، اِس لئے ارکان کی پابندی میں اسلام نے ایسی شدت اور تنگی نہیں برتی، کہ ارکان ذرا اِدھر سے اُدھر ہوں تو نماز ہی باطل ہو جائے، کھڑے ہو کر نماز کی ادائیگی میں دِقت محسوس ہو تو بیٹھ کر پڑھ لی جائے بیٹھنے میں زحمت محسوس ہو، تو لیٹ کر پڑھ لی جائے۔ آخر میں یہاں تک ہے، کہ محض اشارات سے نماز ادا ہو سکتی ہے، نماز میں قبلہ رُو ہونا، آدابِ صلوٰۃ میں سے ہے لیکن قرآن کو یہ خطرہ محسوس ہو، کہ لوگ محض کسی سمت ہی کو مقدس نہ سمجھ لیں اور اس کو جوہر صلوٰۃ میں داخل نہ کر لیں، اس لئے دو تین مرتبہ دہرا کر کہا کہ یہ آداب و ذرائع میں داخل ہے، اور حقیقتِ نماز کا جزو نہیں، آداب کی پابندی مفید ہے لیکن آداب کو آداب ہی سمجھا جائے، ان کو اُصول کا ہم وزن نہ بنایا جائے۔ وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ۔ اور اللہ ہی کی ہے مشرق اور مغرب، پس جس طرف تم مُنہ کر لو، اُسی طرف اللہ کا رُخ ہے۔ اصل چیز نیکیوں کی طرف سبقت کرنا ہے۔ نماز اور اس کے ارکان سب اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ وَلِکُلٍّ وِّجْھَۃٌ ھُوَ مُوَلِّیْھَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ۔ اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جدھر کو وہ اپنا مُنہ کرتا ہے پس تم نیکیوں کی طرف بڑھو۔

عبادات کی ظاہری صورتیں اور اطوار نیکی کا اصل مقصود نہیں ہیں، نیکی کی ماہیت یہ ہے، کہ حقائق پر ایمان رکھتے ہوئے اعمالِ صالحہ پیدا کئے جائیں، رحم اور عدل اور ایثار اور صبر کی مشق کی جائے۔

نیکی یہی نہیں ہے، کہ اپنا مُنہ مشرق و مغرب کی طرف کر لو، بلکہ اصل نیکی اُن کی ہے جو اللہ اور آخرت اور فرشتوں اور کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے، اور جنہوں نے اللہ کی محبت میں قریبیوں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور

مانگنے والوں کو اپنا مال دیا، اور غلامی سے لوگوں کی گردنوں کو چھڑانے میں مال صرف کیا جو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے، جب عہد کیا تو اپنے وعدے کے پورے رہے تنگی اور تکلیف اور خوف کے وقت صابر رہے۔ یہی لوگ سچائی والے اور پرہیزگار ہیں"۔ (البقرہ ۲ - آیت ۱۷۲)۔

اسلام کے مخالفوں، بلکہ بعض مسلمان کہلانے والوں نے بھی اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے، کہ اس نے زندگی کی تمام جزئیات کو ایک اٹل نظامِ فکر و عمل میں جکڑ دیا ہے۔ یہ اعتراض حقیقت میں قرآن پر نہیں، بلکہ ہماری فقہ کے بعض حصوں پر وارد ہوتا ہے۔ قرآن پر یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ مسلمان فقہا اور علما اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق تفصیلی احکام کے دفتر تیار کرتے رہے۔ چونکہ یہ احکام متغیّر حالات اور مختلف افہام کا نتیجہ تھے، اِن میں اکثر باتوں کے متعلق اختلاف رائے رہا، ہر ایک نے نیک نیتی سے جو کچھ صحیح سمجھا وُہ فتوےٰ دیا، جب تک مسلمانوں پر ذہنی جمود طاری نہ ہوا، تب تک فقہا کے مذاہب کوئی اٹل چیز نہ تھے، اور آئمہ فقہا میں کسی کا یہ منشا نہ تھا، کہ لوگ ان کی تحقیقات اور ان کے فتاوے کو شریعت اسلامی کا ناقابلِ تغیر حصّہ سمجھ لیں اور اس کے مصئون عن الخطا ہونے پر اسی طرح ایمان لے آئیں، جس طرح کہ وُہ قرآن پر ایمان لائے ہیں۔ اُنھوں نے احکام کو قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش کی لیکن کہیں کہیں تاویلات پر اختلاف ہو گیا، احادیث نبوی سے احکام کے استنباط کی کوشش کی لیکن احادیث میں بہت کچھ اختلاف تھا، اس لئے سب فقہا کے لئے ان میں سے متوافق احکام کا استنباط کار دشوار تھا۔ جب مسلمانوں میں تفقہ کا فقدان ہو گیا، تو عوام اور علمائے دین کہلانے والے بے بصر اور جامد لوگ پہلے فقیہوں کے پرستار ہو گئے اور وہی صورت پیدا ہو گئی جو قرآن کریم نے یہود کے متعلق بیان کی تھی، کہ ان لوگوں نے اپنے احبار کو ارباب من دون اللہ بنا لیا۔ اس کے بعد لوگ مسلم کہلانے کی بجائے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کہلانے لگے، اُنھوں نے اپنے اماموں کے اقتباسات

اور فتاوے کو شریعت اسلامیہ کا جزو لاینفک سمجھ لیا، اجتہاد اور اجماع قیاس اور استحسان سب کا دروازہ بند ہو گیا۔ اسلام کی شریعت بھی منو کا دھرم شاستر بن کے رہ گئی۔ قرآن کریم میں جو اصول دین ہیں، وہ وحی الٰہی اور ابدی اسلام ہیں، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ وقتی اجتہاد ہے۔ جو زمانے کی ضروریات کے ساتھ بدل سکتا ہے، اگر اسلام ابدی دین ہے، تو اس میں ایسی تفصیلات دین کا جزو لاینفک نہیں بن سکتیں، جو تمدن اور معاشرت کی کسی خاص صورت سے متعلق تھیں، اسلام نے جو اصلاحیں کیں، ان میں سے بعض ایسی تھیں جو معاصرانہ معاشرت کی کسی ہیئت کو مدنظر رکھ کر کیں۔ رسول کریمؐ نے اسلام کی تلقین میں بھی تدریج کے اصول کو مدنظر رکھا، اور اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا، کہ اسلام کی مکمل اور انتہائی صورت کسی ایک فرد یا قوم میں یکدم پیدا نہیں ہو سکتی، جب کسی قوم میں کسی صحابی کو عامل اور والی بنا کر بھیجتے تھے، تو اسے فرماتے تھے، کہ پہلے ان سے فقط یہ کہنا کہ خدا ایک ہے، جب توحید ان کی سمجھ میں آ جائے، تو پھر اس کے بعد نماز کی تلقین کرنا، اور اس کے بعد زکوٰۃ دینے کو کہنا، اسلام میں جو تدریج افراد اور اقوام کے متعلق زمانۂ رسالت میں درست تھی وہ بعد کے آنے والے تمام زمانوں کے متعلق بھی درست ہے۔ اسلام نے شروع میں جو اصلاحیں کیں وہ اصلی مدارج کے سفر میں بمنزلہ مراحل و منازل کے ہیں، اسلام کے متعلق صحیح نقطۂ نظر یہی ہے، کہ اس کی ہر اصلاح انسان کی آخری ہیئت فلاح نہیں، بلکہ سرِ راہ ایک منزل ہے، انسان کو خدا تک پہنچنے کے لئے لاتعداد منازل کو طے کرنا ہے۔ ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

مولانا رومؒ ایک شعر میں مومن کی منزل کے متعلق فرماتے ہیں، کہ "منزل ما کبریا ست"۔ علامہ اقبالؒ فرماتے تھے، کہ مسلمانوں نے اسلام کو کسی ایک زمانے کی معاشرت کا مرادف سمجھ لیا ہے زندگی ارتقا پذیر چیز ہے اس کی آنے والی صورتیں نئے نئے آئین کی متقاضی ہوں گی۔ اسلام غایت حیات اور نصب العین کا نام ہے، صراطِ مستقیم پر

چلتے ہوئے انسان زندگی کے کیا کیا سانچے بدلیگا، تصور میں بھی اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا، مولانا چراغ علی مرحوم شریعتِ اسلام پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب "مقدمہ تحقیق الجہاد" میں لکھتے ہیں:- "ہمارے مخالف ان ہی عارضی احکام یا رعایتوں پر اڑے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام نے ان نامکمل احکام اور جزوی اصلاحوں کو ایک دائمی اور غیر متغیر قانون بنا دیا ہے، جن پر اعلیٰ درجے کی اصلاحوں کی گنجائش نہیں رہی اور جو ترقی کرنے والے اور شائستہ تمدن کے لئے ایک زبردست روک ہیں آنحضرت کے مفصلہ ذیل احکام میری نظر میں ہیں۔ عورتوں کی ذلیل حالت کی اصلاح۔ غیر محدود تعدد ازدواج کی تحدید۔ طلاق کی آسانی اور لونڈی غلام بنانا آنحضرت کے تمام احکام عام اس سے کہ وہ چند روزہ اور عارضی تھے، یا قطعی اور دائمی، جو ان تمدنی خرابیوں کے رفع کرنے کے لئے دئے گئے تھے، وہ باہم ملے جلے اور مختلف سورتوں میں جابجا پھیلے ہوئے ہیں، اور ترتیب نزول کے موافق مرتب نہیں ہوئے اس لئے جو لوگ قرآن کریم کے مضامین پر عمیق نظر نہیں رکھتے ان کے لئے اس بات کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہے کہ کونسے احکام بمنزلہ درمیانی منزل کے ہیں اور کونسے احکام آخری اور بجائے منزلِ مقصود کے ہیں۔ عام قانون کے مدوّن کرنے والوں (فقہا اور مجتہدین) سے کسی قدر مسامحت ہوئی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اوّل تو وہ ملکی احکام جو عارضی اور بمنزلہ اس درمیانی قدم کے تھے، جو اعلےٰ اصلاح کی طرف لے جاتا ہے، آخری اور قطعی سمجھے گئے، اور ثانیاً وہ ملکی احکام جو صحرائے عرب کے باشندوں کے مناسب حال تھے، تمام زمانوں اور ملکوں کی گردن پر ان کا بار ڈالا گیا۔"

پہلی قومیں کھانے پینے کی چیزوں میں حلال اور حرام کو دین کا نہایت اہم جزو سمجھتی تھیں، ہر مذہب اور تہذیب میں کھانے پینے کے متعلق کچھ چیزیں طیب اور کچھ غیر طیب سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات ان کو ایسا سمجھنا کسی حکمت یا تجربے کی بنا پر ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی تہ میں قومی عادات اور روایات ہوتے ہیں جن کے اندر حکیمانہ اصول کو تلاش کرنا دشوار ہوتا ہے، قرآن کریم نے دو تین چیزوں

کو غیر طیّب قرار دے کر باقی سب کے متعلق ایک عام معقول اُصول بیان کر دیا کہ تمام طیّبات حلال ہیں یعنی تمام ایسے اطعمہ حلال ہیں جو تجربے سے اور طب کے اصول کے موافق جسمانی اور نفسی زندگی کے لئے مفید ہوں، لیکن جس طرح ارکان صلوٰۃ کے متعلق یہ واضح کر دیا، کہ اس سمت یا اُس سمت میں مُنہ کرنا ہی نیکی نہیں ہے اسی طرح قرآن کریم نے یہ تعلیم دی کہ اصل حلال و حرام جس پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اس کا تعلق ایمان اور بے ایمانی اور نیکی اور بدی سے ہے۔

قُل تعالَوا اَتلُ ما حرّم ربُّکُم علیکم الّا تشرکوا بہٖ شیئًا وّ بالوالدین احسانًا ولا تقتلوا اولادکم مِن اِملاقٍ۔ نحنُ نرزقکم واِیّاھم ولا تقربوا الفواحِشَ ما ظھرَ منہا وما بطن ولا تقتلوا النفسَ الّتی حرّمَ اللہُ اِلّا بِالحقِ ذٰلکم وَصّٰکم بہٖ لعلکُم تعقلون (الانعام ۶-آیت ۱۵۲)

اے پیغمبر! لوگوں سے کہو، کہ آؤ میں تم کو وُہ چیزیں پڑھ کر سناؤں، جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہیں وُہ یہ ہیں کہ کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو، اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ تم کو اور اُن کو ہم ہی رزق دیتے ہیں۔ اور بے حیائی کی باتیں جو ظاہر اور پوشیدہ ہیں اُن کے پاس نہ جانا، اور جس کی جان لینے کو اللہ نے حرام کیا ہے، اس کو ناحق قتل نہ کرنا۔ یہ باتیں ہیں جن کا خُدا نے تم کو حکم دیا ہے۔ تاکہ تم سمجھو۔

اسی مضمون کے قریب قریب سورۂ اعراف میں بھی ہے، کہ اصل حرام باتیں تو بیحیائی کی باتیں ہیں، ظاہر اور پوشیدہ گناہگاری اور ناحق دوسروں کے خلاف زیادتی کرنا اور ایسی باتوں کو خُدا کی طرف منسوب کرنا جن کے لئے کوئی سند نہیں اور جن کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حلال و حرام کا تعلّق ایمان اور اخلاق سے ہے، کھانے پینے اور دیگر رسوم و عادات اور آداب عبادات کے متعلق جو باتیں ہیں وُہ ثانوی حیثیت رکھتی ہیں، جس نے ظاہری یا ثانوی حیثیت پر زور دیا اور اصل کو بھول گیا، ایسا ظاہر پرست حقیقی روحانیت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

زاہدِ ظاہر پرست از حالِ ما آگاہ نیست　　در حقِ ما ہر چہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

اللہ تعالیٰ زبردستی تمام انسانوں کے اطوار و عادات کو یکساں اور یک رنگ بنانا نہیں چاہتا، دین کا اصل مقصد نیکی کی طرف سبقت کرنا ہے۔ لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ ہم نے تم میں سے ہر گروہ کے لئے ایک شریعت اور ایک راستہ مقرر کیا، اور اگر اللہ چاہتا تو (تمام نوعِ انسان میں عبادات و رسوم کی یک رنگی پیدا کر کے) سب کو ایک اُمت بنا دیتا، لیکن اُس نے ایسا نہیں چاہا۔ ہر طریقے میں انسانوں کی آزمائش ہو سکتی ہے، نیکی اور بدی کی گنجائش ہر طریقے میں نکل سکتی ہے، اصل مقصد یہ ہے، کہ تمام انسان نیکیوں کی طرف سبقت کریں، خصوصاً اے مسلمانو! تمہیں دین کی اس اصل غایت اور نصب العین کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے

ایمان اور عقل

اسلام کسی ایسے عقیدے کی تلقین نہیں کرتا، جو عقل اور مشاہدہ انسانی کے منافی ہو۔ نبیوں کے اندر ایمان محض عقل اور استدلال سے پیدا نہیں ہوتا، کائنات و حیات کی حقیقت اُن پر براہِ راست منکشف ہوتی ہے، لیکن جو کچھ اُن پر منکشف ہوتا ہے، وہ ایسا نہیں ہوتا، کہ انسانی عقل یا انسانی فطرت اس کی تائید نہ کر سکے۔

اسلام دین کو فطرت قرار دیتا ہے۔ اور فطرت اس کو کہتے ہیں جو ہر جگہ اندر اور باہر جاری و ساری ہے، ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، لیکن خدا جو حقیقتِ کلی ہے، وہ فرماتا ہے کہ میں ہی ظاہر اور میں ہی باطن ہوں، چونکہ خدا کی ذات و صفات میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے ظاہر اور باطن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ اسلام وحدت کا دین ہے اس لئے وہ حیات و کائنات میں کسی اساسی تضاد کا قائل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی تعلیم میں وحی اور عقل میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ جو بات بھی از روئے وحی کی جاتی ہے، اس کے متعلق یہ بھی دعوے ساتھ ہی ہوتا ہے، کہ اے انسانو! اگر تم عقل سے کام لو، اور جہالت و تعصب سے اپنی چشمِ بصیرت کو نابینا نہ کر لو

تو تم اس بات کو حقیقت سمجھو، جو تمہارے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے، کہ دین ایمان بالغیب کا بھی تقاضا کرتا ہے، اس کا صاف جواب یہ ہے کہ حیات لامحدود ہے، اور عقل و مشاہدہ خواہ وہ کسی بڑے سے بڑے حکیم ہی کا ہو محدود ہوتا ہے، جس طرح ہر ظاہر کا ایک باطن ہے، اسی طرح ہر حاضر کے ساتھ غائب بھی ہے، حاضر کم اور غائب زیادہ۔ لیکن اسلام اس ایمان کا متقاضی ہے، کہ کوئی انسان اپنے محدود موجودہ تجربے کو حقیقت کلی نہ سمجھ لے، اور یہ عقیدہ رکھے کہ غیب حاضر سے متضاد نہیں ہے، اور ہر حاضر ایک غیب کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس کی کڑیاں اسی حاضر کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ تمام حکمت حاضر سے غیب کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ سائنس کے دریافت کردہ قوانین کی صحت کا معیار بھی یہی ہے کہ جو حوادث ابھی بطنِ مستقبل میں ہیں اور ظہور پذیر نہیں ہوئے، ان کے متعلق پیشگوئی کی جا سکے۔ سائنس نے موجودات کے ایک حصے کا مطالعہ کر کے اور اس کے قوانین دریافت کر کے یہ ایمان قائم کر لیا ہے، کہ کائنات کے طبیعی پہلو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لامحدود اور نامعلوم کائنات بھی انہیں قوانین کی پابند ہے، جو ہماری عقل اور تجربے میں مسلّم قرار پا چکے ہیں۔ سائنس کا عقیدہ بھی یہی ہے، کہ حاضر کا صحیح علم غیب سے غیر متوافق نہیں ہو سکتا۔ انفس و آفاق کے عوالم الگ الگ معلوم ہوتے ہیں، لیکن وہ ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہو سکتے، نہ ان میں داخلی تضاد ہو سکتا ہے، اور نہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہو سکتے ہیں، اسی طرح وحی والہام اور عقل میں بھی کوئی تضاد نہیں۔ علوم طبیعی اور ریاضیات کے بعض ماہرین نے انکشافات کے متعلق اپنے نفسی تجربات بیان کئے ہیں، ان کا بیان ہے، کہ اپنے علم کے متعلق ان کو بے سعی و کوشش اور بے استدلال ایک الہام ہوا، چونکہ وہ دلائل سے پیدا نہ ہوا تھا، اس لئے اس کے ثبوت میں کوئی دلائل ان کے پاس موجود نہ تھے، اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عرصۂ دراز تک بعد میں استدلال کرنا پڑا، استدلال اور تجربے نے اس کو صحیح ثابت کیا۔ انبیاء کی وحی کی بھی یہی کیفیت ہے ازروئے وحی زندگی کے بعض اہم حقائق ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ عام انسانوں کی عقل

کو ان تک پہنچنے میں بہت دیر لگتی ہے، لیکن جب عقل اور انسانی تجربہ ان تک پہنچ جاتا ہے تو وحی سے حاصل شدہ حقائق عین حکمت معلوم ہوتے ہیں، ہر ایک انسان مورد وحی و الہام نہیں ہو سکتا، جس طرح ہر شخص سائنس میں نیوٹن اور آئن اسٹائن نہیں بن سکتا۔ عام لوگ اور معمولی سائنسدان ان ماہرین کے انکشافات پر اعتبار کر کے تدریجاً عقل اور تجربے سے ان کی تصدیق کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جس قدر سائنس ترقی کرتی ہے، وہ اس ماہر کے الہام کی تصدیق کرتی جاتی ہے۔ قرآن عام انسانوں سے یہی مطالبہ کرتا ہے، کہ تم نبی کی بات کی سچائی کو عقل اور مشاہدے اور تجربے سے پرکھو، کائنات کا بغور مطالعہ کرو تو تم کو اس کی کثرت ایک وحدت میں منسلک نظر آئیگی، تمہارے پاس عقل اور مشاہدے سے بالاتر ذرائع تحقیق نہیں ہیں، لہٰذا تم انہیں سے کام لو۔

اسلام سے قبل اکثر مذاہب نے اپنی بنیاد ایسے عقائد پر رکھی تھی جو نہ کسی کی عقل میں آ سکتے تھے اور نہ کسی کے مشاہدے میں کسی نے توحید و تثلیث کا معما پیش کیا کسی نے ایمان کی بنیاد تمام تر معجزات پر رکھی جن کے سمجھنے میں انسانی عقل عاجز ہو قرآن نے یہ عقیدہ پیش کیا، کہ ایمان کو خدا کی عبادت اور سنت سے اخذ کرنا چاہیے، لوگ اپنی پرانی عادت سے معجزہ طلب کرتے ہیں، اس کے جواب میں قرآن تمام کائنات اور اس کے ہر شعبے کو مشیت و قدرتِ الٰہی کا اعجاز قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو زمین سے چیزیں کس حکمت اور جمال کے ساتھ اُگتی ہیں، ستارے کیسے اپنے مداروں میں حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں، اونٹ کے اعضا اور ماحول کے ساتھ اُن کے توافق پر غور کرو۔ فطرت پر غور کرنے سے تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ اس میں کوئی چیز عبث نہیں ہے کوئی عمل بے معنی نہیں ہے۔ کوئی شغل بے مقصود نہیں ہے، کوئی حادثہ بے آئین نہیں ہے جس کو تم اتفاق کہتے ہو اس کا کہیں وجود نہیں، خدا کی مشیت سراپا عقل، سراپا عدل اور سراپا رحمت ہے، علم کی کمی ہوتی ہے تو بعض حوادث بے آئین معلوم ہوتے ہیں لیکن علم کی وسعت کے ساتھ نافہمیدہ بھی فہم کے حدود میں آ جاتا ہے، کائنات سراپا اظہار بھی ہے، اور سراپا اعجاز اور راز بھی۔ ظہور سے بطون

کی طرف ترقی کرنا حکمت بھی ہے اور دین بھی۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ — ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

اسلام سے قبل بھی ایسا تھا، اور اس کے بعد بھی اکثر لوگ خرقِ عادت میں خُدا کی قدرت کو ڈھونڈتے ہیں، اسلام کا بڑا کارنامہ یہ تھا، کہ اس نے انسانوں میں یہ بصیرت پیدا کرنے کی کوشش کی، کہ جو کچھ روز اُن کے سامنے ہوتا ہے، اس میں خُدا کی حکمت کو تلاش کریں۔ کائنات خُدا کا صحیفۂ قدرت ہے، جو شخص اس صحیفے کو پڑھ کر معرفت حاصل نہیں کر سکتا، اس کے لئے کوئی دُوسرا طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا، جس کو برگ درخت سبز معرفتِ کردگار کا دفتر نظر نہیں آتا، اس کے اندر رسّی کو سانپ بنانے سے ایمان پیدا نہیں ہو سکتا، جو شخص مطالعہ فطرت میں اندھا ہے، وُہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا نبی معلم ہوتا ہے وہ ساحر نہیں ہوتا، خُدا اس کے ذریعے سے لوگوں کو حیران اور مرعوب کرنیوالے مظاہر فطرت پیش کر سکتا ہے لیکن وُہ ایسا نہیں کرتا، اور کہتا ہے کہ اس سے ایمان آفرینی نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کے دل میں ایمان صحیح راستے سے داخل نہیں ہوُا، وُہ ایسے معجزات کو دیکھ کر ھذا سحرٌ مبین کہہ کر بے ایمان کا بے ایمان ہی رہیگا۔ اِسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس نے دین کو فطرت کہا اور حکمت کو خیر کثیر قرار دیا اور عقل کو وحی کا مؤید بنایا، مشاہدہ حاضر کو ایمان بالغیب کے حصول کا ذریعہ بنایا اور دین و دانش کے تضاد کو بے عقلی کا نتیجہ سمجھا۔ جن ادیان کا یہ عقیدہ نہیں تھا، وُہ فطرت کی طرف رجوع کرنے سے گھبرائے، علوم و فنون کی ترقی کو اپنے منافی سمجھ کر ان کی راہ میں مزاحم ہوئے۔ اسلامی تہذیب میں علوم و فنون کی ترقی اسلام کے بنیادی عقائد پر کوئی ضرب نہ لگا سکی، طبیعی قوانین، نفسی قوانین، خیر و شر کے قوانین سب از روئے اسلام سنت اللہ ہیں اور فطرت اللہ ہیں، جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ ان قوانین کو دریافت کرنا حکمت کہلاتا ہے، اور قرآن نے اپنے آپ کو حکمت کی کتاب کہا ہے، اس حکمت کے مطابق جو عمل ہوگا، وُہ عملِ صالحہ کہلائیگا، اور جو زندگی اس کے مطابق ہوگی، وُہ

حیاتِ طیبہ ہوگی، جس طرح فطرت لامتناہی ہے، اسی طرح حکمت بھی لامتناہی ہے، کسی فرد یا قوم کے لئے کسی ایک وقت کا علم کافی نہیں ہو سکتا، اسی لئے مومن کو یہ دعا سکھائی گئی ہے، کہ ربِّ زدنی علمًا۔ یہ دعا نبی بھی کرتا ہے، اور اُمتی بھی، کیونکہ نبی کا علم بھی کسی حالت میں علمِ کُل نہیں ہوتا، دوسروں کے مقابلے میں اس کا علم بیشمار زیادہ ہے لیکن علم کی لامتناہی وسعت کے مقابلے میں نبی بھی اس کو ہمیشہ کم پاتا ہے، اور اس میں اضافے کی دعا کرتا رہتا ہے۔ مذہب کو لوگوں نے غلط طریقے سے پیش کیا اس لئے بعض حکمت پسند لوگ دین سے بیزار ہو گئے، لیکن جو دین اپنے آپ کو حکمت اور فطرت کا مرادف قرار دے اور لوگوں کو تفکر اور تدبر کی دعوت دے اس سے بیزار ہونے کے کیا معنی مسلمانوں نے بھی بہت سے توہمات کو جزوِ دین سمجھ لیا ہے، بالغ نظر حکیمانہ مزاج رکھنے والے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ توحید کے خالص عقیدے کو اصل دین سمجھیں اور قرآن نے حیات و کائنات کے متعلق اس عقیدے سے جو کچھ بطور نتیجہ اخذ کیا ہے اسی کو حکمت سمجھیں اور اسی کو لائحہ عمل بنائیں، اس حقیقت کا نام اسلام ہے، اور باقی سب فسون و فسانہ۔ ؎

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اسلام میں گناہ کی ماہیت

اسلام نے مذہب میں جو انقلابی باتیں کیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے، کہ اس نے گناہ کی حقیقت بتائی۔ اسلام سے قبل مذاہب کا یہ حال تھا، کہ ان میں سے اکثر نے زندگی کو سراپا گناہ بنا دیا تھا، یا گناہ کا خوف اس طرح نفوس پر طاری کر دیا تھا، کہ لوگ گناہ کے ڈر سے زندگی ہی سے گریزاں ہو گئے تھے، بدھ مت نے زندگی کی ہر آرزو کو گناہ قرار دیا، اور اس کا یہ علاج بتایا، کہ زندگی کو مطلقاً بے آرزو کر دیا جائے، ہندو دھرم نے یہ سکھایا کہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے لاتعداد جنم لینے پڑتے ہیں اور یہ آواگون ایسا ہے، کہ شاذونادر ہی کوئی روح اس سے نجات حاصل کر سکتی ہے، گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے بار بار دنیا میں کبھی چوہا بن کر کبھی گدھا بن کر کبھی سؤر بن کر کبھی کتا بن کر آنا

پڑیگا، دُنیا میں جو بے شمار جانور اور حشرات الارض موجود ہیں، ان میں سے معلوم نہیں کتنے انسانوں کی روحیں ہیں جن کی گناہوں کی پاداش میں یہ تبدیل ہیئت ہوگئی ہے، یہودیوں میں بھی گناہ کے تصورات نہایت خوفناک تھے، اُنہوں نے گناہ کو ایسا ہیبت ناک بنا دیا کہ نطشے لکھتا ہے کہ گناہ کا یہ تصور خاص یہودیوں کی ایجاد ہے یہودیوں کے ہاں خُدا اس قدر منتقم اور کینہ توز ہے، کہ گناہ کی سزا فقط گناہ کرنیوالے تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ آنے والی تین پشتوں کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے، یہ تصور مطلق العنان جابر بادشاہوں کے متعلق تھا، جس کو یہودیوں نے خُدا پر لگا دیا، جابر سُلطان جس شخص سے ناراض ہوتے تھے، سزا فقط اسی کو نہیں ملتی تھی، بلکہ اس کا پورا خاندان یا قتل کر دیا جاتا تھا، یا صالح اور معصوم سب کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ توریت میں ہے کہ خُدا کہتا ہے۔ "میں خدا تیرا مالک خُدائے غیور ہوں، جو لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، میں اُن کے ساتھ یہ برتاؤ کرتا ہوں، کہ آبا کے گناہ کا عذاب تیسری چوتھی پشت تک اس کی اولاد کو بھی دیتا ہوں"۔ یہودیوں کا گناہ کی بابت یہ تصور کہ وُہ اولاد کو ورثے میں ملتا ہے، عیسائیت کا بھی ایک اساسی عقیدہ بن گیا، آدمؑ اور حواؑ نے جنت میں جو شیطان نے ورغلانے سے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھایا، اس کی سزا یہیں تک محدود نہ رہی کہ ان کو جنت سے نکال دیا گیا، بلکہ ابدالاباد تک ان کی اولاد کو اس کی سزا ملتی جائیگی، دُنیا میں جو انسان بھی پیدا ہوگا، آدمؑ کا گناہ اس کی فطرت کا جزو ہوگا۔ قیامت تک تمام عورتوں کو یہ سزا ملیگی، کہ وُہ بڑی مصیبت سے بچے جنیں، مردوں کی سزاؤں میں سے ایک سزا یہ ہوگی کہ ان کو محنت کے پسینے سے روٹی کمانی پڑیگی۔ اعمال صالحہ سے بھی گناہ کی یہ سیاہی دُھل نہ سکیگی۔ یہ کہ ایک کے گناہ کی سزا دُوسرے کو مل سکتی ہے وُہ اس دُوسرے مسیحی عقیدے میں بھی موجود ہے کہ مسیح کی مصیبت اور موت انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہوگئی، انسانوں کے گناہوں کا علاج خُدا نے یہی کیا کہ اپنے اکلوتے اور معصوم بیٹے کو بھینٹ چڑھا دیا۔ اس عقیدے میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کا انسانی قربانی کا تصور بھی پایا جاتا ہے، اور یہودیوں کا یہ عقیدہ بھی موجود ہے، کہ گناہگار کی سزا معصوم کو بھی مل سکتی ہے۔ ان عقائد

کو دیکھیں، تو یہودیوں اور عیسائیوں کا خدا نہ عادل معلوم ہوتا ہے اور نہ رحیم، وہ یا جابر سلطان ہے، یا وحشیوں کا خونخوار دیوتا۔

اب ان تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی تعلیم پر غور کیجئے کہ اس نے گناہ کو کیا چیز سمجھا۔ انسان میں کئی قسم کی فطری صلاحیتیں ہیں، وہ احسن تقویم بھی ہے اور گناہ کرتے کرتے اسفل السافلین میں بھی گر سکتا ہے۔ قرآن نے بھی آدمؑ کا قصہ بیان کیا لیکن یہ کہا کہ آدمؑ سے ایک لغزش ہوئی، اس نے معافی مانگی، اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس کے بعد آدمؑ کی تذلیل نہیں بلکہ اس کی تکریم ملتی ہے، اس کو خدا کا سب سے بڑا انعام یعنی نبوت عطا ہوئی اور نبوت کے ساتھ اس کو خلافت الٰہیہ کا اہل بنایا گیا، وہ علم کی بدولت مسجودِ ملائک ہو گیا شمس و قمر اور شجر و حجر کو اس کے لئے مسخر کیا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ آدمی کی فطرت ہے کہ وہ ضرور غلطی کریگا، اور جا بجا ٹھوکر کھائیگا۔ خدا نے اس کو دونوں راستے بتا دئیے ہیں، وہ کبھی صراطِ مستقیم کو اختیار کریگا، اور اس کا انعام پائیگا، اور کبھی راہِ راست سے بھٹک جائیگا، تو سزا کا مستوجب ہو گا۔ لیکن خدا انسان کو ہر وقت ہر گناہ پر نہیں پکڑتا، وہ مواخذہ کرنے میں عجلت نہیں کرتا، قرآن کہتا ہے، کہ اگر خدا سزا میں زود انتقام ہوتا، تو دنیا میں انسان کیا کسی جاندار کا قائم رہنا محال ہو جاتا۔ خدا تواب الرحیم ہے، ہزار بار گناہ کرو اور ہزار بار توبہ کرو تو گناہ کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ ایک کا گناہ دوسرے کو ورثے میں نہیں ملتا، نہ ایک شخص دوسرے کے اعمال کا کفارہ ہو سکتا ہے۔ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ گناہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ قضائے مبرم کی طرح انسان کو چمٹ جائے۔ انسان کی زندگی یہ ہے کہ وہ بھلائیاں بھی کرتا ہے، اور برائیاں بھی۔ بھلائیاں برائیوں کو مٹاتی رہتی ہیں۔ ان الحسنات یذھبن السیّات۔ انسان کو خدا کی رحمت سے کبھی نا امید نہیں ہونا چاہیئے۔ ناامیدی کفر ہے۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔ اللہ کی رحمت ہر چیز اور ہر عمل پر چھائی ہوئی ہے۔ ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جنت اور دوزخ میں جزا اور سزا کے تشبیہی بیانات ہیں۔ جنت کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ

جنّت کی مثال یہ ہے، کہ گویا ایک باغ ہے حدیث شریف میں آتا ہے، کہ جنّت کی اصل کیفیت جو کچھ ہے، وُہ نہ کسی نے آنکھوں سے دیکھی نہ کانوں سے سنی نہ کسی کے قلب میں اس کا تصوّر گزرا، قرآن کہتا ہے کہ جنّت تمام ارض وسماوات یعنی تمام موجودات کی ہم وجود اور ہم وسعت ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں، کہ جنت کوئی مکان یا مقام نہیں، بلکہ انفس وآفاق کی ایک کیفیت ہے۔ اِس خیال کی تائید رسول کریمؐ کے اس جواب سے بھی ہوتی ہے، جو آنحضرتؐ نے حبش کے ایک سفیر کو دیا جب اس نے پوچھا کہ جنّت اگر تمام ارض وسموٰت پر حاوی ہے تو جہنم کہاں ہوگا۔ فرمایا، کہ جب دن طلوع ہوتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے، کہ جس طرح دن اور رات عالم ارضی کی کیفیتیں ہیں، اور جگہ گھیرنے والی اشیاء نہیں، یہی حال جنّت اور دوزخ کا ہے، جس پر خدا کی عالمگیر رحمت آشکارہ ہو جائے، اس کیلئے تمام وجود خیر ہی خیر ہے، اور جس پر یہ رحمت آشکارہ نہ ہو، اس کی اس سلبی کیفیت کا نام دوزخ ہے، گویا جنّت اور دوزخ حالتیں ہیں جو عرفان اور عدم عرفان کے ساتھ وابستہ ہیں، یہ کوئی مخصوص مقامات نہیں، زمان ومکان کا تعلق عالم طبعی سے ہے، عالم طبعی سے ماوراء نہ یہ زمان ہوگا، اور نہ یہ مکان، نہ یہ دہر وزود اور نہ یہ طول وعرض۔ علامہ اقبالؒ نے فکر اسلامی کی جدید تشکیل کے خطبات میں جنّت اور دوزخ کے متعلق یہی لکھا ہے، کہ یہ مقامات نہیں بلکہ احوال ہیں، شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ بھی فرماتے ہیں کہ عالم مثال میں نفسی کیفیات اور مجرد تصوّرات جسمانی اور مادی صورتوں میں رونما ہوتے ہیں۔ جنّت اور دوزخ کی قرآنی مثالوں کو بھی اس نظریہ کے مطابق احوالِ نفسی کی صورت پذیری قرار دے سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ قرآن خدا کے غضب کا بھی ذکر کرتا ہے، اور اس کے رحم کا بھی، خدا میں جلال بھی ہے اور جمال بھی، لیکن جلال ذریعہ ہے اور جمال مقصد۔ رحیمیت اور رحمانیت خدا کے اساسی صفات ہیں۔ ایسا خدا اگر سزا بھی دے تو تہذیبی ہی ہو سکتی ہے، تعذیبی نہیں ہو سکتی۔ گویا خدا کی دی ہوئی سزا ایک عمل جراحی ہے، جس میں تکلیف ضرور ہے، لیکن وُہ ایک اصلاحی عمل ہے، اور اس کا عمل راحت کا پیش خیمہ ہے۔ گناہگاروں بلکہ منافقوں کے متعلق بھی رسولِ کریمؐ کو یقین تھا، کہ گناہوں کی کثرت کے باوجود خدا ان پر مغفرت کر سکتا ہے۔ رسُولِ کریمؐ

نے بعض اصحابؓ سے دریافت کیا، کہ بتاؤ کہ کوئی ماں اپنے بچے کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال سکتی ہے، اُنہوں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے، فرمایا کہ یقین رکھو کہ ماں کو جو محبت اپنے بچے سے ہے اس سے کہیں زیادہ خدا کو اپنے بندوں سے ہے، جو سزا رحمت سے سرزد ہو وہ رحمت کی منافی نہیں ہو سکتی۔ ماں باپ تادیب اور تہذیب نفس کی خاطر اولاد کو سزا دیتے ہیں، اُستاد شاگرد کو سزا دیتا ہے، لیکن یہ سزائیں اصلاحی ہوتی ہیں، انتقامی نہیں ہوتیں، سزا پانے والے کی تکلیف سے سزا دینے والے کو خود بھی تکلیف ہوتی ہے۔

گناہ کے متعلق اِسلام نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا، کہ اس نے گناہگاروں کے لئے گناہ کرنے کے دروازے کھول دئے ہیں، دین کا کام گناہ کی تخریبی کیفیت اور اس کے دردناک نتائج کو واضح کرنا ہے، از رُوئے قرآن گناہ ایک نفسی مرض ہے، ایک قلبی بیماری ہے، لیکن جس طرح خُدا نے ہر جسمانی بیماری کا علاج پیدا کیا ہے اسی طرح ہر قلبی بیماری کا بھی علاج ہے، اگر بیماری ہوتی اور اس کا علاج نہ ہوتا تو اللہ کی رحمت پر شبہ ہو سکتا تھا۔ غالب نے اس مضمون کو کیا عمدگی سے بیان کیا ہے۔ کہتا ہے، کہ ادویات، جمادات اور نباتات ہیں سے بنتی ہیں۔ اور بیماریاں جانداروں کو ہوتی ہیں تدریج تکوین میں خُدا نے جمادات و نباتات کو تمام جانداروں اور انسانوں سے پہلے پیدا کیا، گویا علاج پہلے پیدا کیا اور بیماری بعد میں آئی، انسان سے خُدا کی رحمت کا پتہ چلتا ہے۔ ؎

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جانداربود | پیش ازاں کیں درد رس آں را مہیا ساختی

ہاں اگر کوئی انسان اپنی بیماری کو بیماری نہ سمجھے تو علت و معلول کے عام قانون کے مطابق اس کی بیماری میں اضافہ ہوتا جائیگا۔ فی قلوبھم مرضٌ فزادھُمُ اللہُ مرضاً گناہ یعنی قلبی مرض کا جلد علاج ہو سکتا ہے، بشرطیکہ مریض اس کو مرض سمجھے خود اس کی تشخیص کرے یا رُوحانی اطباء سے اس کی تشخیص کرائے اور جلد اس کا مداوا کرے۔ اگر ایسا نہیں کریگا، تو قدرتی اضافۂ مرض اس کی زندگی کو جہنم بنا دیگا۔

کِسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا | مرض تیرے نزدیک مُہلک ہیں کیا کیا
کہا دُکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا | کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا

مگر وہ مرض جس کو آساں سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیاں سمجھیں (مسدس حالی)

جب گناہ اصرار اور تکرار کی وجہ سے مرض مزمن بن جائے، تو گناہ چونکہ قلبی بیماری ہے اس لئے قلب پر سے دوزخ کے شعلے اُٹھنے لگتے ہیں، دوزخ کی آگ کوئی خارجی مادی آگ نہیں ہے، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ وہ آگ ہے کہ تطلع علی الافئدۃ یعنی دلوں میں سے شعلہ افگن ہوتی ہے لیکن اتنی شدید گناہگاری اور عذاب آفرینی کے باوجود بھی نہ توبہ کا دروازہ بند ہوتا ہے اور نہ رحمت کا دروازہ خدائے تواب و رحیم منتظر رہتا ہے کہ یہ عاصی گناہ سے منہ موڑ کر میری طرف رُخ کرے، ایک سچی توبہ زندگی کا یک بیک رُخ پھیر کر جہنم سے جنت کی طرف لے جا سکتی ہے۔

اسلام نے انسان کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا، کہ خطا و نسیان اس کے ساتھ لگا رہیگا، اور زندگی کا گہوارہ بھلائی اور بُرائی کے درمیان جھولتا رہیگا۔ زندگی کی عام لغزشیں ایسی نہیں ہوتیں، کہ انسان خدا کے خوف اور عذاب کے ڈر سے ہمیشہ لرزہ براندام رہے، انسان زندگی کی مختلف حالتوں میں بلندی کی طرف اُبھرتا اور پستی میں گرتا رہتا ہے، کسی آدمی کے متقی یا فلاح یاب ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ اس نے غلطیاں نہیں کیں یا گناہ نہیں کئے، قرآن کہتا ہے کہ خدا کے پاس میزان ہے، اس میزان میں بھلائی اور بُرائی کا ذرہ ذرہ تُلتا رہتا ہے، کامیابی اور ناکامی کا مدار اس پر ہے، کہ ان پلڑوں میں سے کونسا پلڑا بھاری رہتا ہے، اگر ننانویں برائیاں اور سو نیکیاں ہوں تو بحیثیت مجموعی خدا کے نزدیک یہ انسان نجات یافتہ ہے۔

حکیم ابی قورس فرقہ لذتیہ کے امام نے کہا کہ جب تک انسان پر سے دیوتاؤں کا خوف زائل نہ ہو، تب تک وہ اطمینانِ قلب حاصل نہیں کر سکتے، اس لئے اس نے لوگوں کو یقین دلانا شروع کیا، کہ دیوتا انسانوں سے بغض اور حسد نہیں رکھتے، وہ دُنیا والوں کی زندگی سے بے تعلق اپنے آپ میں مگن ہیں، لہٰذا اُن سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، لیکن جب بعض مذاہب نے دیوتاؤں کے وجود سے انکار کر دیا اور ایک خدائے واحد پر ایمان لے آئے تو انہوں نے

بھی خدا کے قہر کا ایسا بھیانک نقشہ کھینچا، کہ لوگ دیوتاؤں سے چھوٹ کر اس ایک خدائے منتقم و قہار سے کانپنے لگے، ایسی توحید نے بھی موحدوں کو خوف سے نجات نہ دلائی لیکن قرآن کریم جب کبھی نجات یافتہ انسانوں اور حیاتِ طیبہ والے مومنوں کا ذکر کرتا ہے تو ان کی نفسی کیفیت یہی بیان کرتا ہے کہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کہ ان پر کسی قسم کا خوف طاری نہ ہوگا۔ اور نہ وہ حزن میں مبتلا ہونگے۔ دینی اصطلاح میں جس کیفیت کو خوفِ خدا کہتے ہیں اس کا اصل مطلب گناہ اور اس کے نتائج سے بچنا ہے، بیماری کے خوف سے انسان صحت کا خیال رکھتا ہے۔ گندگی کے خوف سے انسان اپنے جسم اور کپڑوں کو بچاتا ہے، کسی محبوب کی ناراضگی کے خوف سے وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس سے محبت کا تعلق خراب ہو جائے صحیح معنوں میں خدا کا خوف بھی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے نہیں، کہ خدا سزا دینے کے لئے آمادہ بیٹھا ہے گناہ خدا سے دوری کا نام ہے اور یہ دوری آپ ہی اپنی سزا ہے۔

بنیادی اسلام مستقبل میں تمام اقوام کا مذہب بننے کی صلاحیت رکھتا ہے

اس مختصر مقالے میں کئی بار دہرایا گیا ہے، کہ اصل دین توحید ہے، اور اس کے یقین اور عرفان کا نام ایمان ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل بھی لاتعداد انبیاء اور اولیاء اللہ توحید ہی کی تعلیم دیتے رہے لیکن تمام ادیان میں کسی نہ کسی طرح اس کی صورت مسخ ہوتی چلی گئی۔ شرک کی مختلف قسمیں اس کی جگہ لیتی گئیں۔ اسلام تمام انبیاء کی تعلیم کو اسلام ہی کہتا ہے جس سے معلوم ہوا، کہ بنیادی طور پر جس چیز کا نام اسلام ہے وہ پہلے پہل محمد رسول اللہ کی تلقین کے ساتھ وجود میں نہیں آئی، نوحؑ اور ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سب اسلام ہی کی تبلیغ کرتے رہے۔ شریعت اور منہاج میں تغیر و تبدل ہوتا گیا، لیکن اصل میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک تناور درخت جس کی جڑیں دور تک زمین کے اندر چلی گئی ہیں، اس کا تنہ قائم رہتا ہے لیکن ہر سال اس میں کچھ شاخیں سوکھ جاتی ہیں، اور کچھ شاخیں نکل آتی ہیں، ہر موسم خزاں میں پرانے پتے جھڑ جاتے ہیں، اور موسم بہار میں نئے پتے نکل آتے ہیں، شرائع اور رسوم و شعائر یہی

شاخیں اور پتے ہیں، جن کے بدلتے رہنے سے ہی حیاتِ نخل میں تری اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ رسولِ کریمؐ کی بعثت کے وقت ادیان کا یہ حال تھا، کہ کہیں بھی توحید اصل اور خالص صورت میں نہ تھی۔ ہندو تہذیب و مذہب پر اسلام کے اثرات کی تحقیق میں ایک عالم ہندو مورخ ڈاکٹر تارا چند نے نہایت بے تعصبی سے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا، اس مقالے میں انہوں نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد صدیوں تک جو مذہبی تحریکیں ہندو قوم میں پیدا ہوئیں، ان میں توحید کے جو عناصر پائے جاتے ہیں وہ اسلام ہی کے رہین منت ہیں۔ ہندوؤں نے وحدتِ وجود کا ایک فلسفیانہ تصور قائم کر لیا تھا جو فلاسفہ ہی کے کام کا تھا، عام سوسائٹی دیوتا پرست تھی۔ اوتار کا تصور بھی تھا، اور بعض مذہبی پیشوا عینِ خدا سمجھے پوجے جاتے تھے۔ اس عظیم الشان مذہبی قوم میں خالص توحید کا تصور غائب ہو چکا تھا توحید کے مسخ ہونے کے ساتھ قوموں کے اخلاق اور ان کے آئین بھی نہایت درجہ خراب ہو چکے تھے عیسائیت کا بھی یہی حال تھا۔ کہ ہندوؤں کی طرح عیسائیوں نے بھی اس برگزیدہ انسان کو خدا کا پاک نبی سمجھنے کی جگہ اس کو عینِ خدا بنا دیا تھا، توحید تقسیم ہو کر تثلیث بن گئی تھی اس کے ساتھ ہی توارثِ گناہ آدمؑ جیسے فاسد عقائد پیدا ہو گئے تھے، دُنیا کو ناپاک اور ذلیل سمجھ کر اس کی طرف سے رُخ پھیر لینا روحانیت کا مقصود بن گیا تھا۔ ایک طرف ہندوؤں نے دھرم شاستر مرتب کر رکھے تھے، جن میں ہر انسان کا مقام اور اس کے ہر عمل کی صورت معین کر دی تھی، آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کا نام و نشان نہ تھا، رسوم و توہمات نے مکارمِ اخلاق کی جگہ لے لی تھی، دین خاص مذہبی طبقوں کا اجارہ بن گیا تھا۔ توحید کی بجائے شرک اور اخلاق کی جگہ رسوم و روایات، مذہب و تہذیب کی یہی مسخ شدہ صورت ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ بدھ مت میں فرار عن الحیات، اور زندگی کے ہر افادی اور ایجابی پہلو سے گریز عین عرفان شمار ہوتا تھا، خدا اور دُنیا اور عاقبت سب وہم و باطل تھے۔ یہودیوں نے اپنے خدا کو ایک قومی خدا بنا لیا تھا یہ خدا دیگر اقوام سے اگر کچھ واسطہ رکھتا تھا، تو وہ معاندانہ تھا، انبیا کی دی ہوئی شریعت میں اپنے توہمات اور شعائر کا بے شمار اضافہ کر کے اس سب پلندے کو دین کہا جاتا تھا، یہاں بھی دین کی اجارہ داری

تھی، دین کا باطن غائب ہو گیا تھا اور کچھ مسخ شدہ بے جان ظاہر رہ گیا تھا، اس ظاہر سے سرِ مو تجاوز کفر کہلاتا تھا۔ مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی اس ظاہر پرستی کے خلاف شدید احتجاج کیا اور بتایا، کہ خدا تنگ نظر منتقم نہیں ہے، بلکہ سراپا محبت و رحم ہے اخلاقِ تزکیہ باطن کا نام ہے، رسوم و شعائر اور قواعد کی ظاہری پابندی دین کی اصلی حقیقت نہیں ہے، ہر قوم نے اپنے تئیں خدا کی مخصوص قوم سمجھ لیا تھا، یہودی کہتے تھے، کہ بہشت ان کے لئے مخصوص ہے، وہ جہنم میں نہیں ڈالے جائینگے، جہنم کی آگ اگر ان کو چھوئیگی بھی تو چند روز تک۔ عیسائیوں نے توحید کو تثلیث اور روحانیت کو رہبانیت بنانے کے بعد یہودیوں کی طرح نجات کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا، اور یہ نجات اعمال صالحہ سے نہیں بلکہ مسیح کے کفارہ ہونے پر ایمان لانے پر موقوف تھی۔ خدا پر ایمان اور اعمال صالحہ نجات کے لئے کافی نہ تھے، ہر جگہ مذہب، صداقت اور نجات کی اجارہ داری بن کر رہ گیا تھا۔ ہر ایک اپنے مخصوص اور منتخب گروہ کے علاوہ تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن سمجھتا تھا۔

اسلام نے نوع انسان پر جو احسان کیا وہ یہ تھا کہ مذہب کو ایک نہایت سادہ حقیقت کے طور پر پیش کیا، اور بتایا، کہ دین اتنا ہی ہے کہ انسان کو اس کا احساس ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق و ناظم ہے، وہ عاقل بھی ہے عادل بھی اور رحیم بھی، موجودات کا اگر عاقلانہ مطالعہ کیا جائے، تو یہ یقین پیدا ہو سکتا ہے۔ تمام خلق عیال اللہ ہے۔ کوئی قوم خدا کی مخصوص قوم نہیں ہے، کوئی قوم نجات کی اجارہ دار نہیں ہے، جو شخص خدا کی طرف رخ کر کے زندگی بسر کریگا، اس میں خدا کے صفات کا عکس جھلکنے لگے گا۔ خدائے حکیم پر نظر جمائے رکھنے سے اس پر موجودات کی حکمت منکشف ہو گی، جس کو قرآن خیر کثیر کہتا ہے، اس کو جزء میں کل، قطرے میں دریا اور ذرّے میں آفتاب دکھائی دیگا۔ اسی طرح خدا کے عدل اور رحمت پر یقین رکھنے کی وجہ سے وہ خود بھی عادل اور رحیم بنتا جائیگا۔ خدا کے اسلامی تصور سے وہ صالح اور محسن بن جائیگا۔ اس طرح کا ایمان رکھنے والا زندگی کو مہمل نہیں سمجھے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ حیات بعد الموت کا بھی قائل ہو گا، خدائے رب و رحیم جس کا کام پرورش کرنا، اور مخلوق کی بقا

اور صلاحیتوں کے لئے مواقع اور اسباب مہیا کرتا ہے، وہ انسانوں کو پیدا کرکے فنا نہیں کرنا جائیگا۔ اگر فرد کی مرگ مرگِ دوام ہو اور جسمانی موت کے ساتھ اس کے نفس پر بھی فنائے مطلق طاری ہو جائے تو اس کے یہ معنی ہونگے، کہ خدا نہ خالق ہے اور نہ رب اور نہ رحیم۔ ہر تکوین اور ہر آفرینش ایک فعلِ عبث ہو جائیگی۔ اخلاق کے اقدار اور نیکی کے نتائج اگر فانی اور آنی جانی ہیں تو اخلاقی احساس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائینگی۔ اسلامی توحید سے اخلاق فاضلہ اور بقاءِ روح منطقی نتائج کے طور پر اخذ ہو سکتے ہیں سب کا خدا ایک ہے۔ اس لئے خدا کا قانون سب کے لئے مساوی ہے۔ اس میں اقوام اور ملل کی کوئی رو رعایت نہیں، فطرت کے طبیعی قوانین سب کے لئے مساوی ہیں اسی لئے روحانی اور اخلاقی قوانین بھی سب کے لئے برابر ہیں۔ اسلام میں حق اور فلاح و نجات کی صلائے عام ہے۔

خدا کی مغفرت اور جنت محدود نہیں، کہ اس میں بس ایک چھوٹے سے گروہ کے لئے ہی جگہ ہو۔ اسلام کا خدا رب العالمین ہے، فقط رب المسلمین نہیں، رب النصاریٰ نہیں، رب الیہود نہیں، اسی طرح اس کا رسول رحمۃ اللعالمین ہے، خدا نے شعوب و قبائل اور ملل بنائے ہیں، ان کی تہذیبوں اور ان کے شعائر میں کم و بیش فرق ضرور رہیگا، جیسا کہ ان کی شکلوں ان کے ماحول اور ان کی آب و ہوا میں فرق ہے، اس فرق کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں، لیکن بنیادی اخلاق میں انسانوں کو متفق ہونا چاہیئے۔

یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکرٍ و انثیٰ وجعلنٰکم شعوباً وقبائلَ لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہِ اتقٰکم ان اللہ علیمٌ خبیرٌ۔ (الحجرات ۴۹ آیت ۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری شاخیں اور قبیلے مقرر کئے، تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے، جو تم میں بڑا پرہیز گار ہے۔

رسوم رواج میں تم مختلف اطوار برتو گے، لیکن سب کا رخ نیکیوں کی طرف رہنا چاہیئے۔ اگر یہ بات موجود ہو، تو ہر مذہب والے اور ہر قوم کو حیاتِ طیبہ اور نجاتِ اخروی

حاصل ہوسکتی ہے، اصل چیز احسان اور اخلاق ہے۔ وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا السمٰوٰت والارض اعدت للمتقین الذین ینفقون فی السراء والضراء والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس ط واللہ یحب المحسنین والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسہم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبہم ومن یغفر الذنوب الا اللہ ولم یصروا علیٰ ما فعلوا وھم یعلمون ۔" اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو، جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے، اور وہ ان پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے، جو آسودگی اور تنگی دونوں میں خرچ کرتے ہیں، غصے کو دباتے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرتے ہیں، اللہ نیکی کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان سے کوئی بے حیائی سرزد ہو جائے اور اپنے نفس پر ظلم کریں، تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا گناہ معاف کرنیوالا کون ہے، اور جو بیجا کام کرتے ہیں اس پر جان بوجھ کر اقرار نہیں کرتے۔"

قرآن کا دعویٰ ہے، کہ اسلام دین فطرت ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ جو نظریہ وہ انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ انسان کی فطرتِ صحیحہ میں سے پیدا ہوسکتی ہے، دین فطرت ہی تمام نوع انسان کا دین بن سکتا ہے، لیکن خدا کہتا ہے کہ تمام نوع انسان امتِ واحدہ نہیں بن سکتی، جس سے معلوم ہوا، کہ امتیں یا ملتیں کم و بیش اختلافِ احوال اور تنوع اطوار کے ساتھ ہمیشہ باقی رہینگی، جس طرح خدا نے اختلاف الوان و السنہ کو اپنی آیات قرار دیا ہے، اسی طرح یہ اختلاف بھی ان آیات میں شمار ہوسکتا ہے کہ مختلف ملتوں میں عبادات اور شرائع میں گونا گونی ہو، تمام نوع انسان از روئے فطرت اپنے آداب و اطوار میں ایک نہیں ہوسکتی۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

رسولِ کریمؐ نے نہ صرف توحید کی تعلیم دی اور اس کو معقول اور فطری انداز میں پیش کیا بلکہ خاص شعائر پر ایک گروہ کی تنظیم بھی کی، اس میں ایک خاص قسم کا ڈسپلن قائم کیا، اس تمام ڈسپلن کا اصلی مقصد یہی ہے، جو دین کا اصلی مقصد یعنی توحید کے عقیدے اور اعمالِ صالحہ کو استوار کرنا۔ لیکن خدا نے دیکھا، کہ موحد افراد دیگر ادیان میں بھی پائے جاتے ہیں، جن کا عقیدۂ توحید بھی درست ہے، اور ان کے اعمال بھی صالح ہیں۔ بعض ایسے لوگ اپنی سوسائٹی کی روایات کی وجہ

سے اس مخصوص جماعت میں داخل نہ ہو سکے، جو رسُول کریمؐ نے تیار کی تھی، اسلام کی فراخدلی یہ ہے کہ ایسے افراد کے متعلق اس نے نہایت درجہ رواداری برتی ہے' ان کے ایمان اور ان کے اخلاق کی تعریف کی ہے۔ ان کو اسلام میں اسی طبقے میں داخل کیا ہے' جس نے خُدا کی طرف اپنا رُخ کر کے زندگی بسر کری اور وُہ محسن تھے ایسوں کے لئے بھی قرآن میں وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اولیاء اللہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں لَا خوفٌ علیھم ولاھم یحزنون' از رُوئے قرآن مومن و محسن افراد دو قسم کے ہو سکتے ہیں' ایک وُہ جن کو محمد رسُول اللہ کی رسالت کو کماحقہٗ سمجھنے کا موقعہ ملا اور وُہ نبیؐ کی مقرر کردہ شریعت پر عامل ہوئے' دُوسرا وُہ طبقہ جو معاشرتی، روایاتی یا تاریخی مجبُوری کی وجہ سے اس مخصوص جماعت کے ڈسپلن میں نہ آسکا لیکن وُہ جہاں بھی رہا، موحد رہا اور اس کے اخلاق صالح رہے ہے' اس نے اسلام کچھ اپنی فطرت اور کچھ اپنے مقتدرے نبی کی نبوت سے حاصل کیا، وُہ عبادت کرتا ہے' لیکن اس کی عبادت میں مسلمانوں کی صلوٰۃ کے ارکان اور پابندیٔ اوقات نہیں' وُہ مما رزقناھم ینفقون پر عمل پیرا ہے۔ غریبوں اور مسکینوں اور یتیموں کی بھلائی کے لئے اپنا مال' اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کرتا ہے لیکن اس کی خیرات مُسلمانوں کی مقرر کردہ زکوٰۃ کے نصاب کے مطابق نہیں۔ ہو سکتا ہے' کہ وُہ زکوٰۃ مخصوصہ سے کہیں زیادہ خیرات کرتا ہو۔ وُہ عہد کا پابند ہے' اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے' ایسا امین ہے کہ اگر سونے کا ڈھیر اس کے پاس امانت رکھوا دو' تو اس میں ایک حبہ کی خیانت نہ کرے۔ کوئی نبی اپنے آپ کو منوانے نہیں آتا، بلکہ خدا پر یقین اور اخلاقِ صالحہ کی تلقین کے لئے آتا ہے۔ اگر اس نبی کی اُمت اور جماعت کے باہر کچھ لوگ ایسے ملتے ہوں جن میں وُہ باتیں موجود ہیں' جو اصل مقصود ہیں' تو ایسوں پر نجات کا دروازہ بند کرنا حد درجے کی تنگیٔ نظر ہوگی۔ یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں نے یہی تنگیٔ نظر پیدا کر لی تھی، وُہ کسی ایسے شخص کو جو موحد اور صالح بھی ہو مستحق نجات نہیں سمجھتے تھے، جو حرف بحرف ان کے تمام جزئی عقائد اور ان کی شرائع کا پابند نہ ہو، اسی تنگ نظری اور دین کی حقیقت سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے ایمان نے رسولِ کریمؐ جیسے موحد اور امین کو بھی مستحق نجات نہ سمجھا۔ قرآن نے جابجا دین میں اس تنگ نظری کی مذمت کی ہے۔ جن گروہوں سے اسلامی جماعت برسرِپیکار رہتی -

ان کی بابت بھی قرآن نے یہ تلقین کی، کہ ان میں سب افراد ایک ہی طرح کے نہیں ہیں، ان میں سے بھی تم کو مستثنےٰ لوگ ایسے ملیں گے جو بڑے نیک اور خدا پرست ہیں۔ دین کی بابت یہ وسعتِ تعلیم قرآن میں جا بجا پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو ایک جگہ مختلف ملتوں کا نام لے کر وضاحت کے ساتھ یکجا کر دیا ہے، تاکہ دین کے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر میں کوئی شبہ نہ رہے۔

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن باللہِ والیومِ الآخرِ وعمل صالحاً۔ فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون۔ "وہ لوگ جو نبی کریمؐ کی خاص مومنین کی جماعت میں داخل ہوئے اور وہ لوگ جو یہود ہیں یا نصرانی ہیں یا صابی ہیں، اگر ان پر یہ بنیادی باتیں پائی جائیں، کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اعمال صالح ہیں، تو ان کی بھی نجات یقینی ہے۔ یہ بھی خدا کی مغفرت کے دائرے سے خارج نہیں ہیں، کیونکہ ایمان اور عملِ صالحہ کی حقیقت ان میں موجود ہے۔

جن مسلمان علماء نے اسلام کو اسی طرح تنگ کرنے کی کوشش کی ہے، جس طرح کہ دیگر ادیان نے اپنے آپ کو محدود و محصور کر لیا تھا، ان کو قرآن کریم کی ان آیات سے بہت پریشانی ہوتی ہے، اور وہ اپنی کھینچا تانی کی تاویلات سے قرآن کریم کی اس وسعت کو اپنے قلب کی تنگی میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان علماء کا حال وہی یہود و ہنود والا حال ہے۔ خدا تو کھول کھول کر عطوفت کی داد لگا کر کہتا ہے، کہ جو ملتیں خاص مومنوں کی جماعت سے باہر ہیں، ان میں بھی اگر یہ اساسی باتیں پائی جائیں، تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بھی راہِ راست پر ہیں، لیکن مسلمان علماء نے یہ کہنا شروع کر دیا، کہ ایک فاسق و فاجر جو مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہے، وہ کمال درجے کے اخلاقِ صالحہ والے افراد سے جو غیر مسلم جماعتوں میں ہوں افضل و ارفع ہے، گنہگاری کے باوجود مسلمان کی نجات کی توقع ہو سکتی ہے لیکن غیر مسلم اعمالِ صالحہ کے باوجود بھی جہنم کا ایندھن ہے۔ یہود بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے اور اسی قسم کی اجارہ داری کے مدعی تھے۔ قرآن کو اس تنگ نظری کی جا بجا مذمت کرنی پڑی، لیکن شومئی قسمت سے قرآن خواں جماعت خود اسی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ ایک صاحب علم شخص ڈاکٹر عبدالحکیم جو پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کا مرید تھا، اس کے بعد اس کو مرزا صاحب کے

دعاوی غلط معلوم ہوئے، تو اس نے اپنی بیعت توڑ دی، مجھے اس جماعت کے ایک نہایت معتبر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب سے معلوم ہوا، جو خود بھی اس جماعت سے نکل چکے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالحکیم کا جماعت احمدیہ سے جو اختلاف ہوا وہ اور امور کے علاوہ اس آیت کی تفسیر کے متعلق تھا۔ وہ اس آیت کے صاف اور واضح معنوں کو صحیح سمجھتا تھا، کہ بعض غیر مسلم بھی جن میں یہ بیان کردہ صفات پائے جائیں نجات یافتہ ہیں، احمدی جماعت کے علاوہ عام مسلمان علماء بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں، کہ محض توحید اور اعمال صالحہ سے نجات نہیں ہو سکتی۔ جدید مذہبی تحریکوں میں سے ایک تحریک کے امام نے جو بڑے اچھے مقالہ نویس ہیں اس پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے، کہ اس آیت کے معنوں میں لوگوں نے جو وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ دین کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے، اور قرآن کریم پر سب سے بڑا بہتان ہے۔ افسوس ہے، کہ اب مسلمان بھی اپنے مخصوص عقائد و شعائر و طریق عبادت کی بنا پر اسلام کو ایک فطری اور عالمگیر دین بنانے میں ویسی ہی رکاوٹ بن گئے ہیں جیسی کہ قبل اسلام کی تنگ نظر ملتیں تھیں۔ ان کے نزدیک نسلی مسلمان ہونا، یا مردم شماری کا مسلمان ہونا عقائد کے متعلق کچھ زبانی اقرار اور ظواہر شعائر و عبادات کی پابندی قلبی طور پر موحد اور عملاً صالح ہونے کے مقابلے میں افضل ہو گئی ہے۔

حال میں سویڈن سے ایک مشہور اخبار کا نمائندہ پاکستان میں فقط اس غرض سے آیا کہ وہ سمجھنا چاہتا تھا، کہ اسلام کا نظریۂ حیات کیا ہے، اور اس نظریہ حیات پر کس طرح ایک ترقی پسند اور مہذب و متمول مملکت کی بنا رکھی جا سکتی ہے، وہ مجھ سے ملا اور مجھ سے کہا کہ میں موحد ہوں، اور دہریت کو غلط سمجھتا ہوں، مغرب کی مادیت دہریت اور مادی اشتراکیت سے بیزار ہوں۔ میں نے اس کو اسلام کا نقطۂ نظر علم و عمل اور جماعت و مملکت کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کو سن کر اس نے کہا کہ ہم جیسے عیسائیوں اور تم جیسے مسلمانوں میں کیا فرق ہے، خدا کے بارے میں ہم ایک ہی عقیدہ رکھتے ہیں، اور اعمال صالحہ کی بابت بھی ہم بہت کچھ متفق ہیں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا، کہ دنیا کی تمام موحد جماعتیں یا افراد ایک متحدہ محاذ دہریت اور مادیت کے خلاف قائم کریں۔ ہم میں اور تم میں

دین اور اخلاق کی بنیادی باتیں تو مشترک ہی ہیں، کیا ہم اس اشتراکِ عقائد کی بنا پر اشتراکِ عمل پیدا نہیں کر سکتے۔ مَیں نے اس کو جواب دیا کہ تم کو شاید یہ سُن کر تعجب ہوا، کہ اسلام نے تیرہ سو برس پیشتر یہی صلائے عام دُنیا کے تمام موحدوں کو دی تھی، کہ آیا تم اور ہم توحید اور اعمالِ صالحہ کی بنا پر اشتراکِ عمل سے کام کریں، یہود اور نصاریٰ نے اس دعوت کو قبول نہ کیا، لیکن اسلام کی طرف سے یہ صلائے عام ہمیشہ کے لئے موجود ہے، اگر تم اس پر لبیک کہو، تو یہ عین منشائے اسلام ہے، ہماری طرف سے پورا تعاون ہوگا کیونکہ یہ اسلام ہی کی دعوت ہے۔

ایک مُسلمان مقالہ نگار نے تمام ایسے غیر مسلموں کو منافق قرار دیا ہے، جو اسلام کے مدّاح ہیں اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں لیکن اعلان کر کے مُسلمانوں کی جماعت میں داخل نہیں ہوتے۔ کارلائل نے تمام انبیاؑ میں سے محمد رسول اللہ کو منتخب کر کے بطلِ نبوت قرار دیا لیکن مُسلمان نہیں ہوا، گبن نے اسلام کی تعریف کی اور مسیحیت کی مذمت کی لیکن مُسلمان نہیں ہوا، زمانۂ حال میں برنارڈ شا نے اسلام کے متعلق کہا کہ مستقبل میں نوعِ انسان کا دین اور ادیان کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ مشابہ ہوگا۔ اتنا کہنے پر بھی اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہ کیا۔ حال میں انگلستان کے متبحر مورخ ٹائن بی نے لکھا ہے، کہ اسلام نے انسانیت کے ایسے اہم مسائل حل کئے ہیں، جن کے حل کرنے میں عیسائیت اور مغربی تہذیب کو کامیابی نہ ہوتی۔ اس کے باوجود بھی مسیح کا یہ نام لیوا، اعلان کر کے مُسلمانوں کی جماعت میں شامل نہیں ہوا۔ اس قسم کے سینکڑوں اہلِ مغرب ہیں، جو اسلام کی حقانیت کے از روئے تحقیق قائل ہو گئے، ان میں سے بہت تھوڑے اپنے دین کو بدل کر اسلامی جماعت میں شامل رہے۔ زیادہ تر اپنی اپنی ملت ہی میں داخل رہے۔ لیکن اپنی ملت کو اسلام کی توحید اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف توجہ دلاتے رہے، یہ کس قدر تنگ دلی اور تنگ نظری ہے کہ ایسے بے تعصب لوگوں کو ریاکار کہا جائے۔ واقعہ یہ ہے، کہ مُسلمانوں میں یہودیت اور ہندوئیت کا عقیدہ جاری وساری ہو گیا ہے مُسلمانوں کی اپنی جماعتوں کی حالت ہر جگہ ابتر ہے، نہ دین کے بارے میں ان کی بصیرت میں نور رہا ہے، اور نہ وہ اپنی

دُنیا کو درست کر سکے ہیں۔ اِس کے باوجود وُہ یہ توقع رکھتے ہیں، کہ دُنیا کا ہر موحد و مصلح اعلان کر کے ان کی اس فرسُودہ جماعت میں ضرور داخل ہو، اور جب تک چند مخصوص ظواہر کا پابند نہ ہو جائے، تب تک نہ اس کی نجات ہو سکتی ہے، اور نہ کسی فاسق و فاجر ظاہری مسلمان پر اس کو ترجیح ہو سکتی ہے۔

کلیّات و جزئیات

حکمت کلیات کا نام ہے، حیات و کائنات میں اشیاء و حوادث کی کثرت ہے، لیکن یہ کثرت ہر جگہ آئین و قانون میں منضبط اور منسلک ہے، حکمت کثرت کے اندر وحدت کا عرفان ہے یا جزئیات کے اندر ان کلیات کی تلاش ہے جو قانون ہونے کی وجہ سے غیر متغیر ہیں، اشیار اور حوادث میں ہر لحظہ تغیر ہوتا ہے، اشیار کے اندر کون و فساد ہے، وُہ بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ لیکن جن قوانین کے مطابق وُہ بنتی اور بگڑتی ہیں وُہ قانون کلیات ہونے کی وجہ سے تغیر پذیر نہیں ہوتے، جو علوم حکمت کی پیداوار ہیں، وُہ قومی نسلی اور جغرافیائی تفریقات سے ماورے ہیں، ریاضی سب اہلِ علم کے لئے مساوی ہے، طبیعات میں قومیّت کو دخل نہیں، اس میں کسی قوم کا اجارہ نہیں ہاں یہ ضرور ہوتا ہے، کہ کسی وقت ایک قوم اور کسی وقت دوسری قوم تحقیقات میں دُوسروں کے مقابلے میں پیش قدمی کرتی ہے، علوم و فنون نے دنیا کے ایک سرے سے دُوسرے تک نوع انسان کو مسلمات پر متحد کر دیا ہے اخلاقیات کے بنیادی اُصول بھی تمام مہذّب قوموں میں بہت کچھ مساوی ہیں۔ دین کا کام دُنیا میں فساد کو مٹانا اور امن و آشتی کو ترقی دینا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ دین ہی نے نوع انسان کو متخاصم گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے، اور ایک گروہ دُوسرے گروہ کے جان و مال و آبرو پر ڈاکہ ڈالنا جائز سمجھتا ہے۔ اس وقت دنیا میں دو قوتیں طاغوتی کام کر رہی ہیں، ایک وطنی یا نسلی قومیّت اور دُوسرے مذہبی تعصب وطن پرستی نوع انسان کی وحدت کی قائل نہیں، اسی طرح مذہبی تعصب بھی وحدتِ دین سے گریز کرتا ہے اسلام مذہب کو حکمت اور فطرت قرار دیتا ہے، اور حکمت و فطرت میں کلیت اور ہمہ گیری ہوتی ہے، جب کوئی دین غیر فطری عقائد قائم کر کے اپنے گرد تعصب کا ایک حصار کھینچ لے تو

اس دین میں عالمگیر ہونے کی صلاحیّت نہیں رہتی - دین کو حکمت کی طرح عالمگیر ہونا چاہیئے - اور وُہ اسی صُورت میں ہو سکتا ہے کہ اس کی بنیاد ایسے کلیات پر ہو جو تمام موجودات پر حاوی ہیں اور تمام انسانوں پر اس کا مساوی اطلاق ہوتا ہے - جس طرح نیشنلزم کا علاج بین الاقوامیت اور وحدتِ انسانی کا احساس ہے، اسی طرح مذہبی تعصب کا علاج یہ ہے کہ مذہب کے ان کلیات پر نوع انسان کو متحد کیا جائے - جو عین فطرت ہونے کی وجہ سے سب کے لئے قابلِ قبول ہوں، اتحاد کلیات ہی میں ہو سکتا ہے، جزئیات میں اتحاد ناممکن ہے - نوعِ انسان کے لئے یہ فطری بات ہے کہ ہر انسان کو غذا ملنی چاہیئے - لیکن تمام افراد اور تمام اقوام کے لئے ایک غذا تجویز نہیں ہو سکتی، ہر فرد اور ہر قوم اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق اپنی غذا متعین کر لیتا ہے اور حسبِ ضرورت اس میں تغیّر و تبدّل کرتا ہے - اسی طرح لباس کا حال ہے، تمام مہذب انسان کسی نہ کسی طرح کا لباس پہنتے ہیں - لیکن ہر قوم کا لباس الگ الگ ہے، جس کا تعلق کچھ آب و ہوا سے ہے اور کچھ قومی روایات سے - یہی حال زبان کا ہے - انسان کا حیوانِ ناطق ہونا ایک فطری امر ہے، لیکن نوعِ انسان میں گروہ گروہ کی زبان الگ الگ ہے - قرآن کا زاویۂ نگاہ دین کے متعلق بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے - دین کے کچھ کلیات ہیں جو تمام نوعِ انسان میں مشترک ہو سکتے ہیں، ان کلیات میں ایک عقیدۂ توحید ہے، اور دُوسرا یہ عقیدہ کہ نیکی اور بدی کے اُصول بنیادی طور پر یکساں ہیں - عقیدہ توحید میں سب سے زیادہ کلیّت ہے - تمام کائنات اس کی شہادت دیتی ہے، جن مذاہب میں توحید کی صُورت بُہت کچھ مسخ ہو چکی تھی، ان میں بھی رفتہ رفتہ توحید کا عقیدہ خالص ہوتا جاتا ہے، ہندوؤں میں بُہت سے موحّد گروہ اور افراد پیدا ہو گئے ہیں، عیسائیوں میں بھی مسیح کو بعینہٖ خُدا یا خُدا کا بیٹا سمجھنے والے کم ہوتے جاتے ہیں، تاریخ فلسفہ کا مشہور مورخ ہائف ڈنگ لکھتا ہے، کہ علوم طبیعہ میں جو کائنات کی وحدت اور آئین کی ہمہ گیری منکشف ہوئی ہے، اس سے عقیدہ توحید کو بُہت تقویت پہنچتی ہے، اسلام نے توحید اور اعمال صالحہ کو دین قرار دیا، اور ملتوں کے شعائر کو ایک

ثانوی جگہ دی اور کہا کہ اصل مقصد توحید کے راستے سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنا ہے
یہ دونوں عقیدے ایسے ہیں، جو حکمت و فطرت کی بنا پر عالمگیر ہو سکتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی دین طریق عبادت، رسوم اور متغیر قوانین کو عین دین سمجھ لے، اور اصل و فرع میں فرق نہ کرے، وہ دین عالمگیر ہونے کی صلاحیت کو کھو دیتا ہے اور نوع انسان کو متحد کرنے کی بجائے اس میں تفرقہ انگیزی کرتا ہے۔ ایسے دین میں ظاہر باطن پر اور فرع اصل پر غالب آجاتی ہے۔ ایسے دین میں لوگ روایت پرست اور قدامت پرست ہو جاتے ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنے تفصیلی آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، اس قسم کی قومیں جامد ہونے کی وجہ سے زندگی کے ارتقاء سے الگ ہو جاتی ہیں۔

مسلمان اس وقت جس چیز کو ازلی اور ابدی اسلام سمجھے ہوئے ہیں۔ اس میں کئی قسم کی چیزوں کی آمیزش ہے۔ اس میں اسلام کے ازلی اصول ہیں، اور تغیر پذیر فروع بھی۔ قرآن کریم میں بھی کچھ وسیع اور بنیادی اصول ہیں جو ازلی اور ابدی دین ہیں، اور کچھ وقتی اور جزئی احکام ہیں۔ وقتی اور جزئی احکام میں نزول قرآن کے وقت بھی رد و بدل ہوتا رہا، صورتِ حال کے ساتھ ساتھ حکم میں بھی تبدیلی ہوئی۔ رسول کریمؐ نے اجتہاد نبوی سے کام لیا، اس کے بعد اسلام کی اصلی روح کے مطابق خلفاء راشدین نے بھی کہیں توسیع کی اور کہیں تخفیف۔ جب تک اسلامی روح زندہ اور ترقی پذیر تھی، اسلامی احکام نے کوئی جامد صورت اختیار نہ کی۔ قرآن کریم میں چور کے لئے قطعِ ید کا حکم تھا، لیکن خود رسولِ کریمؐ اور خلفاء نے ہر حالت میں چور کے ہاتھ نہیں کٹوائے۔ بعد میں فقہا نے اس کے ساتھ بہت سے شرائط وابستہ کئے، کہ کس حالت میں چوری، ایسی چوری شمار ہوگی، جس پر قطع ید ہو سکتا ہے۔ اور کن حالتوں میں چوری ہونے کے باوجود قطع ید کی حد کا اطلاق نہیں ہوگا۔ کئی احکام شرعی منصوصہ اور غیر منصوصہ تھے، جن میں علت کے تغیر سے حکم کا اطلاق یا منسوخ ہو گیا، یا معلق کر دیا گیا۔ قرآن کریم کی ہر نص کے عقب میں ایک علت ہوتی ہے، اس علت کا جاننا حکمت

اور رُوحِ اسلام کا عرفان ہے۔ اگر کوئی مسلمان علت کو جانے بغیر نص کے الفاظ کو چمٹ جائے، تو وہ خدا پرست ہونے کی بجائے الفاظ پرست ہو جائیگا۔ اور رفتہ رفتہ رُوحِ اسلام سے بیگانہ ہو جائیگا۔ ے

حرم جویاں درے را می پرستند   فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد   کہ یاراں دیگرے را می پرستند

اس وقت مسلمانوں کے پاس فقہا اور علماء کی مرتب کردہ فقہ کا ایک دفتر بے پایاں موجود ہے۔ اور مسلمان اس دفتر کی پرستش کر رہے ہیں، ان کے لئے یہ دفتر لال کتاب بن گیا ہے، اُنہوں نے خود زمانے کے حالات کا جائزہ لینا چھوڑ دیا ہے۔ اور ہر مسئلے کا حل اس لال کتاب میں ڈھونڈتے ہیں۔ بیع و شرا، مالیات اور معاشیات کے تمام مسائل بدل چکے ہیں۔ اور ان کی ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں جو ہزار برس نہیں بلکہ دو سو برس قبل بھی کسی کے خواب میں نہ آسکتی تھیں۔ فقہ میں بہت سے اجتہادی قوانین اسلام کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً کاشتکاری کے متعلق جو کچھ احادیث میں ملتا ہے، اس میں بے حد اختلاف ہے لیکن جواز یا عدم جواز کی جو مختلف صورتیں ہیں، جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، وہ حجاز کے حالات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے بعد بہت سی فقہ عراق، شام اور مصر کے معاشی اور تمدنی حالات کو مدِ نظر رکھ کر مدون ہوئی۔ فقہائے کرام میں تفصیلی احکام کے متعلق کثرت سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن خاص خاص گروہوں نے خاص خاص فقہا کی فقہ کو غیر متبدل شریعت قرار دے کر دین کا اٹل جزو بنا لیا، اور اپنے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا۔ رسول کریمؐ نے فرمایا تھا، کہ جو قوم جہاد یعنی زندگی کے ہر شعبے میں جد و جہد کرنا چھوڑ دیگی، وہ مغلوب اور ذلیل ہو جائیگی، یہی بات اجتہاد کے متعلق بھی صحیح ہے۔ اجتہاد کو ترک کر دینے سے بھی قومیں جامد اور پس ماندہ ہو جاتی ہیں۔ فقہا نے اسلام اور احکامِ شریعت کی جو تعبیر کی وہ کہیں صحیح تھی اور کہیں غلط۔ وہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے تھے، اور وہ

نہیں چاہتے تھے کہ لوگ ان کے اجتہاد کو مذہب بنالیں، جہاں حالات کے لحاظ سے ان کی تعبیر صحیح بھی تھی، اور خاص ضرورت کو پورا کرتی تھی، وہاں بھی وہ جوں کی توں اب ہمارے لئے کارآمد نہیں کیونکہ ہماری دنیا ہی بدل گئی ہے۔ ہمارے مسائل کی صورت ہی ایسی ہے، کہ ان کا حل کسی ہزار برس قبل فقیہہ کے ہاں نہیں مل سکتا۔

تمام اہم مسائل میں ایسی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں، جو اس وقت موجود نہ تھیں، اسلامی معاشیات کے کچھ بنیادی اصول ہیں جو قرآن کریم میں ملتے ہیں، وہ جزوِ دین ہیں، اور روحِ اسلام کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن معاشیات کے جو قوانین ہماری فقہہ کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں، اُن میں سے اکثر کی اب حاجت ہی نہیں رہی۔ لونڈی اور غلاموں کے متعلق تمام فقہ دفتر پارینہ ہو چکی ہے لیکن ہمارے لکیر کے فقیر ابھی تک اس کو پڑھتے پڑھاتے، اور اس پر بحث مباحثہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ حفظانِ صحت کے جو قوانین فقہ قدیم میں ملتے ہیں یا جو بعض طبی باتیں اس میں درج ہیں، علوم کی ترقی نے ان میں بہت سی چیزوں کو باطل کردیا ہے۔ مسلمانوں نے اس مدوّن فقہ کو شریعت قرار دے کر تغیر و اصلاح سے بالاتر کر دیا ہے۔ اِس پورے مجموعے کو وہ غیر متبدل اسلام کہ کر پیش کرتے ہیں، اس کے کسی جزو میں ذرا سی تبدیلی سے بھی انہیں ڈر لگتا ہے۔ گویا یہ دین سے انحراف اور کتاب الٰہی میں تحریف ہے۔ معاشی، سیاسی اور تمدنی معاملات میں تمام فقہ کی جدید تدوین کی ضرورت ہے۔ پرانی عمارت کو گرا کر اس کا ملبا اور مسالہ بہت کچھ کام آسکتا ہے لیکن یہ تعمیر گرا کر از سرِ نو بنانی پڑے گی۔ اس کی بنیادیں اسلام کے اساسی اصول ہونگے لیکن اوپر اُٹھنے والی تعمیر کا نقشہ پہلے نقشوں سے بہت کچھ مختلف ہوگا۔

ہر بنائے کہنہ کابادان کنند   اوّل آں تعمیر را ویراں کنند۔

اسلام اسی حالت میں ایک زندہ جاوید اور عالمگیر مذہب رہ سکتا ہے، کہ اس میں اُصول کو اوامر سے الگ کرکے دیکھا جائے۔

اِسلامی شریعت کی بنیاد حکمت اور عدل پر رکھی گئی ہے، اور حکمت و عدل اوامر